حالی کا ذہنی اِرتقا

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

مکتبۂ کارواں کچہری روڈ، لاہور

حالی کا ذہنی ارتقاء

از

پروفیسر الحاج ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

صدر شعبۂ اردو۔ سندھ یونی ورسٹی۔ حیدر آباد

(سابق صدرِ شعبۂ اردو۔ ناگپور یونی ورسٹی)

مکتبۂ کارواں کچہری روڈ، لاہور

دوسرا ایڈیشن

مطبع : کارواں پریس، لاہور

ناشر: چودھری عبدالحمید ایم-اے

جولائی ۱۹۶۶ء

قیمت : پانچ روپے

انتساب

بہ عالی جناب

علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی صاحب دام اقبالہٗ

بار۔ ایٹ۔ لا۔

(سابق وائس چانسلر سندھ یونی ورسٹی۔ حیدر آباد)

جو غیر معمولی فاضل ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ انسان بھی ہیں

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہاں کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
— حالی

مقدّمہ

یہ مجموعہ راقم الحروف کے چند مطبوعہ مضامین پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً اس طرح شائع ہو چکے ہیں :-

(۱) "حالی کی فارسی شاعری"۔ رسالہ "اردو" کراچی (حالی نمبر)۔ اپریل ۱۹۵۲ء

(۲) "حالی کا ذہنی ارتقاء"۔ " " " (الف)۔ جولائی ۱۹۵۲ء

" " " (ب)۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء

" " " (ج)۔ جنوری ۱۹۵۴ء

(۳) "حالی کی اردو غزل"۔ " " " — اپریل ۱۹۵۵ء

(۴) "سرسید اور مقدمۂ شعر و شاعری"۔ رسالہ "برگِ گل" (سرسید نمبر) اردو کالج کراچی ۱۹۵۵-۵۶ء

لیکن مجموعے میں یہ ترتیب بدل دی گئی ہے اور "حالی کا ذہنی ارتقاء" نہ صرف مقدم ہے بلکہ نفسِ مضمون اور معنویت کے لحاظ سے کتاب بھی اسی نام سے موسوم کر دی گئی ہے۔ ذیلی حاشیے مضمون کی طوالت کی وجہ سے قائم کیے گیے ہیں لیکن طوالت ہی کے خیال سے فہرست حذف کر دی گئی ہے۔ تاہم

"اشاریہ" سے مضامین اور موضوعات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ماخذات بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ موضوعات کے سلسلے میں محنت اور کاوش کس درجے کی گئی ہے لیکن کوشش ضرور کی گئی ہے کہ ان تمام کیفیات اور حالات کا اجمالاً جائزہ لیا جائے جو کسی تحریر کے وقت مولانا حالیؔ کے دل و دماغ کو متاثر کر سکتے تھے۔ دوسرے فضلاء چاہیں تو اس اجمال کو تفصیل سے بدل دیں، تاکہ مولانا کا نفسیاتی مطالعہ زیادہ بہتر طریقے پر ہو سکے۔ مولانا کی مختلف تصانیف پر تبصرے زیادہ طویل نہیں ہیں اور اس خصوص میں مولانا کی اختصار پسندی ہی پسند کی گئی ہے۔

کتاب کے متعلق خود مصنف کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی اور خصوصاً اس مصنف کی رائے تو اور بھی غیر وقیع ہے جسے اپنی خامیوں کا احساس اور اعتراف بھی ہے لیکن یہ صرف فاضل محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب (صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی) برادر مکرم ڈاکٹر سید رفیع الدین صاحب (صدر شعبۂ اردو۔ ناگ پور یونی ورسٹی) اور عزیزم ڈاکٹر سید نعیم الدین صاحب (پروفیسر۔ ناگ پور یونی ورسٹی) جیسے فضلاء کی ہمت افزائی اور علم نوازی ہے کہ انھوں نے ان مضامین کے متعلق اپنی بیش قیمت رائیں خود ہی عنایت فرمائیں اور کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی۔

جزاهم الله تعالیٰ

آخر میں اس قدر اور عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ مضامین چونکہ وقتاً فوقتاً

لکھے گئے ہیں، اسلیئے بعض اقتباسات کی تکرار ہو گئی ہے اس کے لیے یہ عاجز معذرت خواہ ہے۔

دوسرا ایڈیشن یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اور مغربی ممالک میں بھی مقبول ہوئی۔ ڈاکٹر معین جذبی، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی، ڈاکٹر عبدالقیوم وغیرہ نے اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالوں میں جگہ جگہ اس کا حوالہ دیا اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب نے خصوصیت سے اسے سراہا۔ بعض یونی ورسٹیوں میں داخلِ نصاب بھی ہے۔ ایک مصنّف کو اس سے زیادہ خوشی اور تشکر کا اور کیا موقع ہو سکتا ہے!

غلام مصطفیٰ خاں

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد　　سیّد دگر او را نمے از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود　　تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

اقبالؒ نے اس قطعے میں سرسید اور مولانا حالی کی قومی خدمات کا نہایت جامع الفاظ میں جائزہ لیا ہے اور حرم والوں کی "سادہ و رنگین داستان" کے اوراقِ پریشاں کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ سرسید، مولانا حالی سے بیس برس بڑے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے زوال و ادبار، غدر کے کشت و خون، پھر مشتبہ لوگوں کے ساتھ انگریزوں کا بہیمانہ برتاؤ وغیرہ سب کچھ اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بصیرت کی نگاہوں سے جانا پہچانا تھا۔ وہ سرکاری ملازمت میں رہنے کے باوجود خدمتِ قوم کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ سیاسی اور معاشی حالات سے متاثر ہو کر وہ قوم کی فلاح کے لیے یہی رائے دے رہے تھے کہ ع

رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی　　(اقبال)

سرسید نے اسی لیے غدر کو محض ایک فوجی بغاوت ثابت کیا۔ مسلمانوں کو حکومت سے وفاداری کی تلقین کی اور انگریزوں کو مسلمانوں پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا۔ غرضکہ اپنی حکمتِ عملی سے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار

لگانے کی کوشش کی اور اس کے لیے انگریزی تعلیم کو مناسب اور ضروری قرار دیا۔ رفتہ رفتہ قوم کے قوائے عملی میں جان پیدا ہونے لگی اور شاندار مستقبل کی شاہراہیں دکھائی دینے لگیں۔ حالی نے تیس بتیس سال کی عمر تک محض ادبی اور مذہبی ماحول میں وقت گذارا۔ پھر سیاسی شعور پیدا ہوا اور انھوں نے سرسید کے چراغِ راہ سے منزل کا پتا چلا یا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء سے لے کر زندگی کے آخری لمحوں تک یہی مشن ان کے تمام کاموں میں ملتا ہے، اور انہی جگر سوزیوں کا ذکر ان اوراق میں بھی موجود ہے۔ حالی کی ان تمام خدمات کا ترتیب وار جائزہ اسی لیے لیا گیا ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے کس عمر میں اور کیسے حالات میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان سے قوم اور ادب کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔

مولانا حالی ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مولانا کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور بڑی بہن نے سرپرستی کی۔ مولانا "ترجمۂ حالی" میں لکھتے ہیں:-

فارسی اور عربی کی تعلیم

"انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے...... ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی

پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی۔ چند روز بعد بھائی اور بہن نے ۔۔۔۔۔ تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت (۱۸۵۴ء میں) میری عمر ۱۷ برس کی تھی ۔۔۔۔۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے ۔۔۔۔۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا[1] اور قریب ڈیڑھ برس کے (یعنی ۱۸۵۵ء تک) رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم[2] سے پڑھیں ۔۔۔۔۔ میں نے دلی میں شرح سلّم[3] ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

---

[1] سسرال کی خوشحالی کی وجہ سے متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریوں سے یک گونہ بے فکری تھی۔ اہلیہ کا نام اسلام النساء بنت سید باقر علی تھا (تذکرۂ حالی از شیخ محمد اسمٰعیل ۱۹۳۵ء ص ۳۸)

[2] دہلی کے اسی قیام کے زمانے میں حالی نے نواب صدیق حسن خاں کے ایک منطقی مسئلے کی تائید میں ایک عربی رسالہ لکھا تھا جو استاد نے چاک کر ڈالا کہ "اس سے ایک وہابی مولوی کی تائید ہوتی تھی"۔ (مضمون خواجہ غلام الثقلین۔ بحوالہ تذکرۂ حالی از شیخ اسمٰعیل ص ۱۲۱)

[3] میبذی، عربی درس کے متوسطات میں داخل تھی۔ بعض علماء کی طرح مولانا شبلی نے بھی ایک جگہ (مکاتیب شبلی۔ جلد اول صفحہ ۱۵۳) اس کو "سب سے زیادہ نالائق کتاب" کہا ہے۔

سنہ ۱۸۵۶ء

حسن سخن کی ابتدا۔

مولانا حالی نے ۱۲۷۲ھ (سنہ ۱۸۵۶ء) یعنی تقریباً انیس [19] سال کی عمر میں حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر ایک تضمین[1] لکھی تھی اور اس وقت خستہ تخلص اختیار کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سنہ ۱۸۵۷ء والے عالم آشوب "رستخیز بے جا" کو ابھی ایک سال باقی تھا اور مولانا کوئی برس ڈیڑھ برس تک (دہلی سے واپسی پر) پانی پت میں رہ چکے تھے اور اب ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ایک اسامی پر مقرر تھے لیکن اس وقت تک ان میں شعر کہنے کی اچھی خاصی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی، کیونکہ دہلی کے قیام میں گو کہ انھوں نے ایک دو غزل سے زیادہ نہیں لکھی۔ لیکن غالب نے ان کی صلاحیت دیکھ کر کہا تھا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" ضلع حصار کے اس قیام کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پانی پت واپس آنا پڑا۔

---

[1] لیکن دیوان میں ایک قصیدۂ نعتیہ کے حاشیے پر مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "یہ قصیدہ (سلطان دو جہاں کے لیے) سنہ ۱۲۸۱ یا سنہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا ہے اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ . . . وہ تضمین جو حالی سے منسوب ہے اس میں پانچ بند ہیں اور آخری بند میں خستہ تخلص آتا ہے:-

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی   ہاتھ اٹھا سوئے مدینہ دم حاجت طلبی
پڑھ زباں سے زرہ صدق یہ شعر قدسی   سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۲ء

ترجمۂ حالی میں ہے کہ

"۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہِ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (یعنی تقریباً ۱۸۶۲ء تک) پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزرے، اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی (قاری) عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء) مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علمِ ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا، میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اس قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔"

گویا ۱۸۶۲ء تک یعنی تقریباً چوبیس سال کی عمر تک مولانا کی تعلیم غیر مسلسل طریقے پر ہوتی رہی اور اس وقت تک انھوں نے اردو اور فارسی ادب کے علاوہ منطق، فلسفہ، حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ میں

بھی خاصی دسترس حاصل کر لی تھی بلکہ اردو، فارسی اور عربی کی نظم و نثر بھی لکھ لیتے تھے۔

"پھر غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ . . . . سے شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔"[1]

ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی کے مقدمے میں مولانا لکھتے ہیں :-

سنہ ۱۸۶۳ء

نواب شیفتہ کی صحبت۔

"حسن اتفاق سے سنہ ۱۸۶۳ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے ہو گیا اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس (یعنی سنہ ۱۸۷۲ء تک) ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا[2]۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے زیادہ تر جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا جہاں مخاطب صحیح کمیاب تھا، اس لیے وہ فکرِ شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے، لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب

---

[1] ترجمۂ حالی۔ مقالات حالی حصہ اول۔ [2] یعنی نواب شیفتہ کے بچوں کی اتالیقی سپرد تھی۔

ممدوح کا شوق از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت مجھ کو فارسی یا اردو میں فکرِ شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا۔ مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی . . . . .“

ترجمۂ حالی میں مولانا نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ذوق کے سلسلے میں اپنا حال اس طرح لکھا ہے :-

”انھوں نے (شیفتہ نے) اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں (المتوفی ۱۸۵۲ء) کو دکھایا تھا، مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے . . . . ان کی مصاحبت میں میرا طبعی میلان بھی . . . چمک اٹھا . . . انہی کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا تھا . . . .“ [۱]

۱۸۶۴ء

اسی زمانے میں یعنی ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان کسی وقت انھوں نے ایک ”مولود شریف“ لکھا تھا۔ اس میں مناجات اس طرح شروع ہوتی ہے :-

”الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ“

---

[۱] ترجمۂ حالی۔ مقالاتِ حالی حصہ اول۔ حالی کا ایک شعر بھی ہے :-

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفیض ہوں　　شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میرؔ کا

تیرا ملک لازوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے
کیا کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے؟... [1]

مناجات کا انداز شروع سے آخر تک یہی ہے اور جوشِ عقیدت میں یوں ہی ہوا کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نثر اچھی اچھی منظوم مناجات سے زیادہ دلکش ہے۔

اسی زمانے کا یعنی سنہ ۱۲۸۱ھ (سنہ ۱۸۶۴ء) یا سنہ ۱۲۸۲ھ (سنہ ۱۸۶۵ء) کا لکھا ہوا (جیسا کہ قصیدے کے حاشیے سے معلوم ہوتا ہے) ایک نعتیہ قصیدہ دیوان میں ملتا ہے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیے　　　سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

یہ قصیدہ ۳۳ شعروں کا ہے اور قدیم طرز میں لکھا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مولانا جہانگیر آباد میں نواب شیفتہ کے مصاحب تھے اور غالب کو اپنا کلام بھیجا کرتے تھے اس سبب ظاہر ہے کہ انھوں نے غالب ہی کی زمین اختیار کی ہوگی جو یہ ہے:-

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے　　　رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

محمد اکرام صاحب نے غالب کی اس غزل کا سالِ تصنیف سنہ ۱۸۴۵ء لکھا ہے [2] جب کہ

---

[1] مقالاتِ حالی حصہ اول۔ خواجہ سجاد حسین نے یہ مولود شریف سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع کرایا تھا۔

[2] غالب نامہ (چوتھا ایڈیشن صفحہ ۹۹) اسی غزل کا ایک شعر ہے:-

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے　　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

یہی نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد اپنی بربادی کی حالت میں حرمین شریفین میں تھے۔ نواب صدیق حسن سنہ ۱۲۸۵ھ (سنہ ۱۸۶۸ء) میں حج کو گئے۔ وہ اِبْقاءُ المِنَنْ (بھوپال سنہ ۱۳۰۵ھ) کے صفحہ ۹۹ پر لکھتے ہیں کہ "منجملہ مساکین کے ایک نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد بھی وہاں مجھ کو

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں ذوق، مومن اور غالب بھی مدعو تھے۔ بہرحال حالی کی جو پندرہ سولہ غزلیں قدیم رنگ کی ان کے دیوان میں موجود ہیں وہ اسی عہد سے تعلق رکھتی ہوں گی جب کہ ان پر غالب اور شیفتہ کا اثر غالب تھا۔ [1]

اسی زمانے میں یعنی غدر کے بعد عیسائی مبلغین نے سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر بہت بڑا فتنہ پھیلا رکھا تھا، لیکن ان کی تردید میں ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی وغیرہ نے بڑی ہمت سے کام لیا اور شروع کے [2] دو بندگوں نے فنڈر پادری کو شکست فاش دے کر عیسائیت کے دعویداروں کو بہت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ایک حالتِ تباہ میں ملے۔ ایک جوڑا لباس عمدہ کا میں نے ان کو بھی دیا۔ اور نہایت عبرت حاصل ہوئی کیونکہ یہ وہ شخص تھے جن کی مدح میں غالب دہلوی نے بہ زمانۂ نوابی یہ شعر کہا تھا:۔ دیا ہے اور کو بھی . . . . الخ"

اسی زمین میں شیفتہ کی دو غزلیں ہیں:۔

ع سحر گئے جو وہ گل گشتِ گلستاں کے لیے

ع جو کوئے دوست کو جاؤں تو پاسباں کے لیے

شیفتہ کے استاد مومن کی بھی یہی زمین تھی:۔

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے　　سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے

اور ذوق نے بھی اسی زمین میں کہا تھا:۔

صبا جو آئے خس و خارِ گلستاں کے لیے　　قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دلِ آشیاں کے لیے

[1] غالباً اسی زمانے میں یعنی غالب کی زندگی میں ان کی ایک نعتیہ غزل پر تضمین لکھی تھی:۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است　　عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است

نیچا دکھایا۔ تاہم وہ زمانہ ایسا تھا کہ مختلف پادریوں نے ہندوستان کی فضا کو بہت زیادہ مسموم بنا دیا تھا۔ ایک پادری (مرتد) عماد الدین پانی پتی نے ہدایت المسلمین[۱] کتاب مسلمانوں کے خلاف لکھی تھی اس کے جواب میں مولانا حالی نے سنہ ۱۲۸۳ھ (سنہ ۱۸۶۷ء) میں[۲] جہانگیر آباد کے قیام میں رسالہ "تریاقِ مسموم" لکھا۔

سنہ ۱۸۶۷ء

اس زمانے میں حالی کے دل میں دینی حمیت اور مذہبی جوش بہت زیادہ تھا اور اسی زمانے کی یادگار وہ عربی قصیدہ بھی ہے جو انھوں نے مولانا شاہ عبد الغنی نقشبندی مجددیؒ کی خدمت میں حج کے ایام میں مدینہ طیبہ میں بھیجا تھا ضمیمہ کلیاتِ نظمِ حالی میں وہ اڑتالیس[۴۸] شعروں کا قصیدہ موجود ہے اور اس میں سالِ تصنیف سنہ ۱۲۸۳ھ (سنہ ۱۸۶۷ء) بھی موجود ہے۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے :-

هَوَى الْحُورِ يَهْوِي كُلَّ حِبْرٍ وَّ نَادِبٍ
وَفِتْنَةُ قِسِّيْسٍ وَّ زَلَّةُ رَاهِبٍ

اسی کے ساتھ ایک عربی خط بھی بھیجا گیا تھا وہ بھی اسی مجموعے میں موجود ہے۔

۱؎ شیخ محمد اسمٰعیل نے اس کتاب کا نام تحقیق الایمان لکھا ہے۔ (تذکرۂ حالی صفحہ ۱۱۹)
یہ عماد الدین سنہ ۱۸۹۷ء تک ضرور مرتد رہا لیکن اس کا بھائی خیر الدین اور باپ سراج الدین تائب ہو گیا تھا۔ (تذکرۂ حالی میں نامۂ حالی دیکھیں صفحہ ۲۵۳)۔

۲؎ اسی سال شیفتہ کا دیوان پہلی بار مطبع رضوی دہلی سے شائع ہوا اس کا ایک نسخہ حبیب گنج میں موجود ہے لیکن دیوان شیفتہ (لاہور سنہ ۱۹۵۴ء) کے مقدمہ صفحہ ۴۳ میں ہے کہ پہلا ایڈیشن میرٹھ سے سنہ ۱۸۵۴ء میں نکلا تھا۔

پھر قصیدے کے محاسن کے متعلق جو خط بطور رسید کے آیا تھا اس کے شکریے میں مولانا نے دوسرا عربی خط لکھا تھا وہ بھی اسی مجموعے میں ہے۔

سنہ ۱۸۶۸ء سنہ ۱۸۶۹ء

سنہ ۱۸۶۸ء میں محکمۂ تعلیم پنجاب کے ایک انعامی اعلان کے مطابق فارسی صرف و نحو پر مولانا نے ایک کتاب "اصولِ فارسی"[1] لکھی تھی جو فلسکیپ سائز کے ۲۵۹ صفحات پر مشتمل تھی ان کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کے پاس محفوظ تھی، لیکن وہ طبع نہیں ہوئی۔[2]

اس کے بعد ہی یعنی سنہ ۱۲۸۵ھ (سنہ ۱۸۶۹ء) میں "آہ غالب بمرد"[3] استاد کا غم ایک سعادت مند شاگرد کو کیوں کر خاموش رہنے دیتا؟ مولانا حالی روئے اور ایسے روئے کہ دوسرے شعرا بھی اس رونے پر رشک کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیۂ غالب جو اسی سال ترکیب بند کی شکل میں لکھا گیا وہ نہ صرف اپنی نوعیت میں مختلف ہے بلکہ حقیقی جذبات کے اظہار میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس مرثیے نے ایک نئے مرثیے کی بنیاد ڈالی اور تمام تصنع و تکلف سے بے نیاز ہو کر صحیح جذبات کی صحیح ترجمانی کی۔ روانی اور برجستگی کے ساتھ فصاحت غضب کی ہے۔ مثلاً

---

[1] اس میں پانچ حصے ہیں یعنی علمِ صرف، علمِ نحو، علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع۔ دیکھیں "نقوش" لاہور۔ بابت اکتوبر نومبر سنہ ۱۹۵۳ء۔ [2] تذکرۂ حالی۔ صفحہ ۱۳۱۔

[3] یک شنبہ ۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء۔

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج — رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بہ مثل — دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اس کا تھا اور اسکی دوات
تھیں تو دلّی میں اسکی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلّی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اسکی ذات

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

ایک روتے بسورتے ہوئے شخص نے کس بھولے انداز میں یہ شعر کہے ہوں گے :-

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

حالی اس وقت دلّی ہی میں تھے۔ جنازے میں شریک ہوے اور شیفتہ[1] کی طرح خود بھی اشک بار رہے۔

---

[1] غالب نے کہا تھا:-

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالبؔ کے ساتھ حالیؔ کو جو عقیدت[1] تھی اس کا اظہار حالیؔ کے اس فارسی قطعے میں بھی ہے جو یادگارِ غالبؔ میں موجود ہے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

تو اے کہ رونقِ پیشینیاں بہم شکست | زنظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی | چہ بذلہ ہا کہ باندازِ دلربا گفتی
رسید نشئہ عرفاں چو ذکر می راندی | شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی

اس طرح انیس[19] اشعار ہیں۔ اس قطعے کے متعلق یادگارِ غالبؔ میں لکھتے ہیں:-

"جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم متخلص بہ شیفتہ و حسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا اور ان دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے اور میں انہی کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ کر بھیجا ...... مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے:-

تو اے کہ عذر فرستادہ بسوئے رہی | سزد کہ جانِ گرامی براں نثار کنم

اس قطعے میں نو اشعار ہیں جو یادگارِ غالب اور ضمیمہ کلیاتِ حالیؔ میں بھی موجود ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا حالیؔ نے نواب شیفتہ جیسے سخن فہم و سخن سنج اور

---

[1] اس عقیدت کے باوجود ایک مرتبہ جب غالبؔ نے نظیریؔ کے ایک شعر کو ناقص المعیار قرار دیا تھا تو حالیؔ نے ایک "عریضہ" میں اس شعر کی خوبیوں پر بحث کی تھی۔ یہ فارسی "عریضہ" ضمیمہ کلیاتِ حالی میں موجود ہے۔

شیدائے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مصاحبت میں نہ صرف ادب و شعر میں پختگی حاصل کی تھی بلکہ دین کے لیے والہانہ تعلق بھی پیدا کیا تھا اور کم از کم اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کے دینی جوہر کو مصطفوی تعلق اور شیفتگی کی وجہ سے جِلا ضرور حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ عربی نظم و نثر، مولود شریف اور نعتیہ قصیدے سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں اور اسی زمانے کی یادگار ہیں، لیکن اس قسم کے تمام ادبی جواہر ریزوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی قدامت کے باوجود نہایت سلیس اور برجستہ ہیں اور ان کے "تکلف" میں بھی کوئی تصنع نہیں ہے۔

سرسید پر ایک مضمون۔

پھر سنہ ۱۸۷۰ء کے مشاغل کا علم تو نہیں ہے البتہ سنہ ۱۸۷۱ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (صفحہ ۱۱۸) میں ان کا ایک مضمون[۱] "سید احمد خاں اور ان کے کام" شائع ہوا تھا۔ اس کے شروع میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان کا ہم زبان ہوا نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے ان کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی۔ لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا۔ . . . . ."[۲]

اور مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ

---

[۱] سرسید کا رسالہ تہذیب الاخلاق یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ھ (۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء) کو جاری ہو چکا تھا سرسید اور حالی کی پہلی ملاقات غالباً سنہ ۱۸۶۸ء میں نواب شیفتہ کی رفاقت میں ہوئی تھی۔ شیفتہ نے ایک موقع پر غزل میں یہ شعر غالباً سرسید کے متعلق ہی لکھا تھا:-

بے سخن نسبت مع اللہ ہے اُسے   قوم سے جس کو کہ نسبت ہوگئی

[۲] مقالاتِ حالی۔ حصہ اول۔

"میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں، نہ ان کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود ہے بلکہ اس کا منشاء وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔"

چنانچہ دونوں بزرگوں کے خلوص نے ہم آہنگی پیدا کی اور قومی اصلاح اور ذہنی نشو و نما کے لیے جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں ان کے بارِ احسان سے قوم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

سنہ ۱۸۷۲ء

نواب شیفتہ کے انتقال (۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) کے بعد مولانا حالی دہلی آئے "یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی کے نامور شعراء کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انہی دنوں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرعِ طرح پر تین غزلیں[1] بڑے دعوے سے لکھیں۔ جن لوگوں کی جا و بے جا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے۔ . . . . (لوگوں کی بے التفاتی کی وجہ سے) اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منھ میاں مٹھو بنتے ہیں کیونکہ اس زمانے کے خیالات کے موافق

---

[1] غالباً یہ تین غزلیں "تو نے" کی ردیف کی ہیں جو دیوان میں موجود ہیں۔

اس بات کا یقین تھا کہ . . . . شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔"

مولانا حالیؔ نے قصیدے کی ابتداء ضرور اس طرح کی ہے:۔

میں بھی ہوں حُسنِ طبع پر مغرور مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

. . . .

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور

لیکن اِن کے یہاں "غرور" نہیں ہے بلکہ محض بے نیازی ہے کیونکہ:۔

دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور

یہ قصیدہ ۷۵ شعروں کا ہے لیکن باوجود قدامت کے حالیؔ کی ملازمت اور حقیقی جذبات نگاری کے لیے حجت ہے اور خود انکساری کے لیے برہان قاطع:۔

مجھ سے جو کام چاہیے لیجے جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور

حسد و بغض و غیبت و بہتان بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور

ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور

. . . .

فی المثل ہے مری مسلمانی جیسے زنگی کا نام ہو کافور

. . . .

لہ دیوانِ حالی۔ حاشیہ جو اس قصیدے پر ہے۔

لاہور کو روانگی —

اس کے بعد ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں حالی لاہور چلے گئے۔ لکھتے ہیں:-

"نواب شیفتہ کی وفات[1] کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے

---

[1] شیفتہ کا سالِ وفات مولانا حالی نے سورۂ دہر کی ایک آیت سے اخذ کیا ہے اور یہی آیت قبر پر کندہ ہے: "وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا۔" اس کے عدد ۱۲۸۶ھ ہوتے ہیں۔ اور حالی کے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر نے ان کی تاریخ اس طرح نکالی تھی (مقدمہ دیوان شیفتہ۔ نظامی ایڈیشن):-

از سرِ زاری بباید گفت ایں　　رحمتِ حق بر محمد مصطفیٰ = ۱۲۸۶ھ (مطابق ۱۸۶۹ء)

لیکن "ضمیمہ اردو کلیاتِ نظمِ حالی" (مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ) کے صفحہ ۹۹ میں دیوان حسرتی (شیفتہ) کی تقریظ کی سرخی یہ ہے: "تقریظِ دیوانِ فارسی حضرت حسرتی رحمۃ اللہ تعالیٰ کہ در سالِ ہزار و ہشتصد و ہفتاد و دو مسیحی در زمانِ حیاتِ مصنف مغفور نوشتہ بود۔" یعنی ۱۸۷۲ء میں شیفتہ کو زندہ کہا ہے اور اسی مجموعے کی تمہید میں حالی نے لکھا ہے: "حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم .... سے ہو گیا اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔" یعنی وہی ۱۸۷۲ء تک۔ لیکن حالی کے یہ اقوال بعد کے ہیں۔ رسالہ معارف (اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۱۶ء) میں ان کا ایک خط (مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۸۹۸ء) شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا مرزا صاحب کے بہت بعد انتقال ہوا ہے اور وہ یقیناً مرزا کی تجہیز و دفن میں شریک تھے اور میں خود بھی موجود تھا۔" اتفاق سے دہلی کا اکمل الاخبار (بابت ۲۹ ستمبر ۱۸۶۹ء۔ مطابق چہار شنبہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ) پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دیکھا۔ اس میں یہ خبر درج ہے:-

"افسوس کمال افسوس، آج کہ یوم انطباعِ اخبار ہے جناب نواب حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب بہادر المتخلص شیفتہ راہ گذارِ عالمِ بقا ہوئے۔"

انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس[1] میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔"[2]

اس اقتباس کا یہ آخری جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالی کا ادبی "احساسِ پستی" سرسید کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ از خود انفرادی طور پر پیدا ہوا اور اسی احساس نے عبرت اور غیرت دلا کر سرسید کا ہم نوا بنا دیا۔ تاہم یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ عین اسی وقت سرسید بھی اردو ادب کے متعلق اسی قسم کے خیالات پیش کر رہے تھے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق بابت یکم محرم ۱۲۸۹ھ (مطابق ۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء) میں سرسید لکھتے ہیں:۔

---

[1] حالی ۱۸۷۲ء میں لاہور گئے اور غالباً ۱۸۷۴ء کے آخر یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں واپس دہلی آ گئے جیسا کہ آگے عرض کیا جائیگا۔ لاہور کی ملازمت کے لیے پیارے لال آشوب کی سفارش کو بھی دخل تھا۔

[2] ترجمۂ حالی۔ محمد حسین آزاد نے بھی انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں جو ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو منعقد ہوا تھا ایک مضمون "نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات" پڑھا تھا۔ اس کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ "شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروشِ خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوتِ قدسیۂ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔ . . . . . فصاحت و بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکامِ عصر کی قباحت ہے"۔ اس قباحت کی اصلاح کے لئے انھوں نے ضرور مشورہ دیا ہے۔

"علمِ ادب وانشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تُک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط وکتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ ...... فن شاعری جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد، حقیقی تہذیب واخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ واستعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کسی پیرایہ یا کنایہ، اشارہ یا تشبیہ واستعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔" [۱]

سرسید کی اس تحریر سے بہت ممکن ہے کہ حالی نے اثر قبول کیا ہو۔ لیکن یہ بھی

---

[۱] اسی مضمون (تہذیب الاخلاق۔ یکم محرم ۱۲۸۹ھ) میں سرسید نے علمِ ادب وانشاء کی خرابیوں کا پس منظر بھی پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان خرابیوں کی ذمہ داری زیادہ تر قوم کی دینی اور اخلاقی پستی پر ہے۔ لیکن محمد حسین آزاد نے ان خرابیوں کا ذمہ دار سلاطین اور حکامِ عصر کو قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیۂ ماسبق۔

اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ لاہور کے قیام کی بدولت "نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت (حالی کے) دل سے کم ہونے لگی تھی"۔ اور انگریزی لٹریچر کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے کی وجہ سے یہیں سے ان کے دل میں یہ جذبہ ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ اردو ادب کی نہ صرف اصلاح کی جائے بلکہ اس کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھولی جائیں۔

اوپر مولانا حالی کی تحریر کا ایک اقتباس آچکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ کے انتقال کے بعد ۱۸۷۲ء میں مولانا، لاہور چلے گئے تھے۔ دیوان میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

محبت ہر کہ دل میں موج زن ہے — نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے

اس کے حاشیے پر مولانا لکھتے ہیں "یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ اول ہی اول بہ تقریب ملازمت دلی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اس وقت اول تو دلی سے جدا ہونا ہی شاق گذرا تھا۔ دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور و شور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا[۱]۔ اس تنہائی اور سراسیمگی، غم و اندوہ کی حالت میں یہ شعر لکھے تھے"۔

---

[۱] اسی سلسلے کے دو عربی خط بھی ہیں جو حالی نے مرزا اشرف بیگ دہلوی کو بھیجے تھے اور بیماری کی حالت میں منشی محمد اکرام اللہ خاں کی شادی پر بھی سولہ اشعار کی عربی نظم دہلی بھیجی تھی۔ وہ بھی ضمیمہ کلیاتِ حالی میں موجود ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے:-

وَمَا اٰفِذِیْ بِہٖ شَیْءٌ یَسِیْرٌ — بِنَفْسِیْ مَا بِہٖ جَاءَ الْبَشِیْرُ

عربی کلام اور دوسری تصانیف۔

اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت | مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے
رہے لاہور میں آکر سو جانے | یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف | مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام | کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

....

بھلا حالیؔ اور الفت سی ہو خالی | یہ سب تم صاحبوں کا حُسنِ ظن ہے

ایک اور غزل لاہور کے ابتدائی قیام کی یہ ہے :۔

دھوم تھی اپنی پارسائی کی | کی بھی اور کس سے آشنائی کی

مولانا کے عربی مجموعۂ کلام میں نو اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو انھوں نے اسی زمانے میں لاہور سے دہلی کے احباب کو بھیجے تھے اور ان کے فراق میں تھے۔ وہ اس طرح شروع ہوتے ہیں :۔

هَلْ مَنْ يُّبَلِّغُ عَنْ مَحْصُوْرِ لَاهُوْرِ
عَنْ مُّبْتَلًى فِيْهِ بَعْضَ الْكَوْرِ بِالْحَوْرِ

یہ اشعار اور ان کے علاوہ اسی قیامِ لاہور کے زمانے کے دوسرے عربی اشعار سب اسی سلسلے سے متعلق ہیں جن کا آغاز ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ہوا تھا جبکہ مولانا شاہ عبدالغنیؒ (المتوفی ۱۲۹۵ھ) کی مدح میں قصیدۂ بائیہ لکھا تھا۔ ان سب اشعار سے نہ صرف عربی شاعری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان میں

۱؎ ان عربی اشعار اور دوسری تحریروں کا ذکر آگے آئے گا۔

اہلِ عرب کا "سوز دروں" بھی موجود ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا حالیؔ مستقل طور پر عربی میں شاعری کرتے تو وہ اس زبان کے بڑے کامیاب شاعر ثابت ہوتے۔ شاہ صاحبؒ موصوف کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس میں سے تو بالکل صحرائے عرب کی "بو" آتی ہے، بڑی دلکش تمہید اور نہایت لطیف گریز ہے لیکن اس کے بعد جو اشعار لاہور میں لکھے ہیں وہ غالباً بیماری کی وجہ سے تعداد میں کم ہیں اور ان میں وہ ترصیع نہیں ہے جو اس قصیدے کی جان ہے۔ تاہم ان اشعار میں بھی اہلِ عرب کا مخصوص انداز موجود ہے۔ دیارِ سلمیٰ کی یاد، حادثاتِ دہر پر بے چینی کا اظہار، پیامی تلاش اور غم میں گھل جانے کا ذکر عجیب دلکش طریقے پر ہے لیکن اس شعر میں عربی طرز کا "غیر" نہیں ہے:۔

اِنِّیْ اَرَانِیْ وَقَدْ اُنْضِیْتُ مِنْ نَصَبٍ
بِحَیْثُ لَمْ اٰبِ اَنْ اَمْتَازُ عَنْ غَیْرِیْ

بہر حال جیسا کہ خود حالیؔ کی ایک تحریر (مذکورۂ بالا) سے معلوم ہوا ہے وہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں لاہور آئے تھے اور وہیں طبقات الارض کے فن میں ایک عربی کتاب کا اردو ترجمہ کیا تھا، لیکن پروفیسر حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخ اردو (صفحہ ۵۸۶) میں اس کتاب کا نام طباق الارض لکھا ہے اور اس کے ذیل میں یوں بھی لکھا ہے کہ "فرنچ زبان کی تصنیف علم الارض (جیالوجی) کا عربی زبان سے اردو ترجمہ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا لیکن اب نہیں ملتا"۔ غالباً پروفیسر صاحب نے شیخ محمد اسمٰعیل صاحب کے تذکرۂ حالیؔ (صفحہ ۱۳۰) سے اس کتاب کا سال طباعت نقل کیا ہے لیکن شیخ موصوف نے خود بھی "غالباً

۱۸۶۸ء" لکھا ہے۔ حالانکہ مولانا حالیؔ نے جس طرح لاہور آنے کا سال ۱۸۷۲ء لکھا ہے اسی طرح یہ بھی دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ ترجمہ لاہور ہی میں کیا تھا۔ چنانچہ "ترجمۂ حالی" میں صاف طور پر لکھتے ہیں :-

"علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ۔ . . . لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر[1] کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا . . . "

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا جب لاہور آ چکے تھے (یعنی ۱۸۷۲ء) اس وقت ترجمہ کیا تھا۔ لیکن حالیؔ کی اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ ہم کو ابھی لاہور سے دستیاب ہوا ہے جس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے :-

مبادیِ علم جیولوجی

(جس میں طبقاتِ ارضی کی ساخت کا بیان ہے)

جس کو

مولوی الطاف حسین صاحب حالیؔ پانی پتی مدرس اول

زبانہائے مشرقیہ انگلو عربک سکول دہلی نے ایک رسالہ

---

[1] ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر ۱۸۶۵ء کے شروع سے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور انجمن پنجاب کے صدر مسلسل پانچ سال تک رہے۔ یونیورسٹی کمیٹی کے سکریٹری اور پنجاب یونیورسٹی کے سب سے پہلے رجسٹرار بھی تھے۔

عربی سے جو فرانسیسی سے ترجمہ کیا گیا تھا اردو میں ترجمہ کیا

۱۸۸۳ء

بمنظوری جناب صاحب رجسٹرار پنجاب یونی ورسٹی
مطبع انجمنِ پنجاب میں نظام الدین پرنٹر کے اہتمام سے چھپی

کتاب میں دو۲ مقدمے ہیں - پہلا مقدمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

آغاز کتاب

مقدمہ ۱

جیولوجی وہ علم ہے جس سے طبقاتِ زمین کے اسرار اور اس کے اجزا کی حقیقت اور جو تغیرات ابتداء سے اب تک اس پر واقع ہوئے ہیں یا آئندہ واقع ہوں ان کی کیفیت معلوم ہو اور اس کے طبقات میں جو ذخیرے ودیعت کیے گئے ہیں اُن کے ٹھکانے دریافت کرنے کے طریقے بغیر امداد کسی اور علم کے منکشف ہو جائیں . . . .

دوسرا مقدمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

زمین کی تاریخ اور اس کے آغاز میں پوری بحث کرنی اس بات پر موقوف ہے کہ علم ہیئت کے بڑے بڑے مباحث جنکی اس مختصر میں گنجائش نہیں خوب شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے جائیں - اس لئے یہاں صرف ان دو دعووں کے

لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جو کرۂ زمین کی عمر کے باب میں نہایت مشہور ہیں. . . . .

یہ کتاب ۳/۴ ۵ × ۱/۲ ۹ سائز کی ہے اور جلی حروف کے ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے کاتب اس کا مرزا امداد علی ہے۔

اسی زمانے میں انھوں نے فارسی زبان کے قواعد پر ایک کتاب "اصولِ فارسی" لکھی تھی جو غالباً کبھی شائع نہیں ہوئی[1]۔ بعض تذکروں سے "تاریخِ محمدی[2] پر مصنفانہ رائے" (اسی عیسائی کی کتاب پر تنقید) اور شواہد الالہام بھی اسی عہد کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

۱۸۷۲ء میں مولانا نے ایک نظم "جواں مردی کا کام" ستّر اشعار کی لکھی تھی یہ بچوں کے لئے تھی اور ایک انگریزی حکایت سے ماخوذ تھی وہ اس طرح شروع ہوتی ہے :-

تھا کسی ملک میں اک دولتمند حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند

دولت مند نے اپنے تینوں بیٹوں کو پورا مال تقسیم کر دیا، لیکن ایک گراں مایہ جواہر دینے کے لیے یہ شرط مقرر کی کہ وہ اسی کو دیا جائے گا جس نے کوئی "کارِ نمایاں" کیا ہو۔ بڑے بیٹے نے ایک امانت کو واپس کر دینے کا قصہ سنایا۔ منجھلے بیٹے نے

---

[1] اس کا سال تصنیف بھی حامد حسن قادری صاحب نے (داستان تاریخ اردو ص ۵۸۶) ۱۸۶۸ء لکھا ہے جو تذکرۂ حالی (ص ۱۳۱) سے نقل کیا ہوگا۔

[2] پادری عماد الدین ہی نے تاریخ محمدی بھی لکھی تھی۔ اس پر حالی نے تبصرہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسٹر ولی اور غیر متعصب مغربی مصنفین کی آراء کا مقابلہ کیا ہے۔

ایک بچے کو ڈوبنے سے بچایا تھا اس کا ماجرا سنایا اور چھوٹے بیٹے نے ایک جانی دشمن کی جان بچانے کا ذکر کیا۔ باپ نے چھوٹے بیٹے کے کام کو "جواں مردی کا کام" قرار دیا اور وہ جواہر اسی کو دیا۔

بہر حال لاہور کے قیام میں مولانا حالی نے بہت سے کام کیے۔ ۳۵ سال کی عمر ہو چکی تھی، ذہنی پختگی کے ساتھ ساتھ علمی اور عملی پختگی اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو نظم و نثر میں نہ صرف مشق بلکہ استادانہ مہارت پیدا ہو چکی تھی۔ قومی اور ملکی سیاست کو بالغانہ نظر سے دیکھ سکتے تھے اور اپنے پرائے کی پوری طرح تمیز کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ادب کے لیے نئی شاہراہ کھولنے کو تیار ہوئے چنانچہ مجموعۂ نظم حالی پر جون ۱۸۹۰ء کا لکھا ہوا دیباچہ ملتا ہے اس کی ابتدائی عبارت یہ ہے:-

سنہ ۱۸۷۴ء

"۱۸۷۴ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور[1] میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد (المتوفی ۱۹۱۰ء) کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو کہ مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا

---

[1] اس جملے سے پنڈت کیفی نے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے (منشورات "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ") کہ "خواجہ (حالی) مرحوم اس واقعے کا اقبال کرتے ہیں کہ انجمن پنجاب کا مشاعرہ ان کے لاہور آنے سے پہلے قائم ہو چکا تھا" خود مولانا حالی کی ایک تحریر میں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وہ لاہور میں ۱۸۷۲ء میں آچکے تھے اور اوپر کے جملے میں وہ صرف اتنا کہہ رہے ہیں کہ ۱۸۷۴ء میں جب کہ میں لاہور میں تھا تو آزاد نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در و بستِ عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے۔"

آگے چل کر اسی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

"بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہنہ مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس مشاعرے میں[۱] شریک ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی مگر راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بسبب ناموافقت آب و ہوا[۲] لاہور سے تبدیل ہو کر دلی چلا آیا۔ مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی زبان میں جیسی کہ

---

[۱] حامد حسن قادری صاحب اس پہلے مشاعرے (مناظمے) کی تاریخ اپنی کتاب (صفحہ ۴۲۶) میں ۸ رمئی ۱۸۷۴ء لکھتے ہیں اور یہ کہ وہ گیارہ مہینے جاری رہا، لیکن پنڈت کیفی، منشورات کے گیارہویں مضمون میں ۳۰ رجون ۱۸۷۴ء لکھتے ہیں اور یہ کہ اس میں نو شعراء نے شرکت کی حالی کا نام ان میں نہیں ہے۔ وہ نو شعراء یہ تھے:
انور حسین ہما۔ اشرف بیگ اشرف۔ الٰہی بخش رفیق۔ محمد حسین آزاد۔ محمد مقرب علی، دلی دہلوی۔ قادر بخش۔ عطاء اللہ۔ علاؤ الدین محمد۔ اورینٹل کالج میگزین (فروری۔ مئی ۱۹۳۴ء) میں انجمن پنجاب کا حال بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔

[۲] اس زمانے میں وبائی بیماری تپ دلرزہ وغیرہ کا دور دورہ دہلی کے اطراف میں بھی تھا میرٹھ کے لارنس گزٹ کا وہ اقتباس ملاحظہ ہو جو "منشورات" (پنڈت کیفی) کے گیارہویں مضمون میں ہے۔

اردو ہے ہو بھی نہیں سکتا ..... چار مثنویاں ......
(۱) برکھا رت، (۲) نشاطِ امید، (۳) حبّ الوطن، اور
(۴) مناظرۂ رحم و انصاف، اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں۔"

اسی دیباچے میں ان نظموں میں "نئی طرز" کی بنیاد رکھنے کے متعلق کہتے ہیں کہ "ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔" چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ آزاد کے مقابلے میں حالی نے جس نئی طرز کی بنیاد ڈالی ہے وہ بہت پائیدار ثابت ہوئی اور جدید شاعری کی تعمیر اسی بنیاد پر ہوئی۔

برکھا رت، ایک سو پینتالیس اشعار کی نظم ہے جس میں پہلے تو بارش نہ ہونے کی وجہ سے جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا ذکر ہے۔ پھر ایسی تکلیفوں کے بعد بارش ہونے پر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہے اور شکرگزاری ہے۔ اس کے بعد باغوں میں جھولوں کا پڑنا اور پرکیف مناظر کا حال ہے پھر اپنے حسب حال بھی کچھ اشعار ہیں۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:-

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جانِ برسات — وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

اور حقیقت نگاری کے ساتھ تشبیہات و استعارات جس روانی اور برجستگی کے ساتھ ہیں ان کی مثالیں بہت کم دوسری جگہ نظر آتی ہیں :-

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا | اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے | اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے | گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی | اک آتی ہے فوج، ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے | ہمراہ ہیں لاکھوں توپخانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑ چلتی | چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر دڑیڑا | گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

اسی نظم میں حالی نے اپنے امراض و عوارض کے متعلق بھی ذکر کیا ہے جو غربت میں زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں :-

بیزار اک اپنے جان و تن سے | بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا | چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غمخوار ہے کوئی اور نہ دلجو | اک بارغ میں ہے پڑا لب جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی | آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

نشاطِ امید – اس کے بعد ہی نظم "نشاطِ امید" لکھی۔ اس میں بانوے شعر ہیں اور اس طرح شروع ہوتی ہے :-

اے مری امید مری جاں نواز | اے مری دلسوز مری کارساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ | درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

عشق میں اور رنج میں میری شفیق　　　کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

اس میں سر سید کی طرح "امید کی خوشی" بیان کی گئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ سر سید کے اس مضمون کو دیکھ کر حالی کو ترغیب ہوئی ہو۔

حُبِّ وطن ۱۸۹۰ء

پھر نظم "حُبِّ وطن" بھی اسی سال لکھی گئی اس میں ۲۱۵ شعر ہیں اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

اے سپہرِ بریں کے سیارو　　　اے فضائے زمیں کے گلزارو

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا　　　اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمۂ سحری　　　اے شبِ ماہتاب تاروں بھری

اے نسیمِ بہار کے جھوکو　　　دہرِ ناپایدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز

تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

اس نظم میں مختلف لوگوں اور قوموں کی وطنی محبت کا ذکر ہے کہ شدرون نے غلامی اختیار کر لی، لیکن وطن نہ چھوڑا۔ پیغمبروں کی بھی اسی محبت کا ذکر ہے۔ چنانچہ ملک کی مختلف جماعتوں کو متحد کرنے کے لیے کوشش کی ہے اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریز سب سے بڑا حریف تھا اور جس جلسے میں یہ نظم پڑھی جانے والی تھی وہاں سبھی گروہوں اور جماعتوں کے لوگ تھے اس لئے نفسیات کا تقاضا ہے کہ شاعر اسی قسم کے شعر لکھے:۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا ہو بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

مناظرۂ رحم و انصاف

پھر اسی سال یعنی ۱۸۷۴ء میں "مناظرۂ رحم و انصاف" نظم بھی لکھی، یہ بھی انجمن پنجاب کے لیے لکھی تھی۔ اس میں ایک سو انیس شعر ہیں۔ وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا — کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے تری سخت تحیر ہے ہمیں — ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں — آنکھ میں تیری مروّت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں — دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں

اس نظم میں پہلے رحم کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ پھر انصاف کی زبان سے رحم جیسی خوبی کی برائیاں بتائی گئی ہیں اور حالی نے اپنے شاعرانہ انداز میں رحم اور ہمدردی کے وہ معائب پیش کیے ہیں جو نطشے (Nietzsche) کے رنگ میں معلوم ہوتے ہیں لیکن "عقلِ پُرکار" کی بدولت خود انصاف کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ عقل یوں گویا ہوتی ہے:۔

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالبِ بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سُن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرِ مو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تُو

. . . .

. . . .

فرق اصلا نہیں تم دونوں ہیں لڑتے کیوں ہو
جب کہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو
وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اس کا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا
رحم کہلائی جو مظلوم کی فریاد سُنی
عدل ٹھہری جو سزا ظالم بے رحم کو دی

سرسید نے یکم محرم ۱۲۹۲ھ کے رسالۂ تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے:۔

"مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی مناظرۂ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے درحقیقت ہمارے علم ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگیِ الفاظ، صفائی بیان، عمدگیِ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں، بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعثِ افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لئے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر ان

مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ اگر ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامینِ عشقیہ او رمضامینِ خیالیہ اور مضامین بیانِ واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی اور وہ دن ضرور آوے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں گے جیسے کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شیکسپیئر پر ناز کرتے ہیں . . . . ."

حالی نے اپنی قوتِ متخیلہ سے "مناظرۂ رحم و انصاف" کے لیے نئے نئے اسباب و علل جمع کیے ہیں اور اس تمثیلی ڈرامے کے لیے بہت دلکش اسٹیج تیار کیا ہے، یہ وہی زمانہ ہے جب کہ محمد حسین آزاد اپنے رمزیہ اور تمثیلی مضامین "نیرنگِ خیال" بھی لکھنے والے تھے اور کرنل ہالرائڈ کی تحریک و تجویز پر "معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں" کھینچنے والے تھے۔ آزاد کے یہ مضامین ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئے تھے اور حالی اپنا "مناظرہ" جو فارسی شعراء کی تقلید میں ہے ۱۸۷۴ء میں پیش کر چکے تھے۔

قیامِ لاہور کی یادگار اور بھی کئی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ گیارہ اشعار کی عربی نظم ہے جو پنجاب کے قائم مقام ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم، کارڈری[1] صاحب

---

[1] غالباً اسی زمانے میں دس اشعار کی وہ عربی نظم بھی لکھی جو مرزا اشرف بیگ دہلوی کی فرمائش پر
(باقی حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

کی شان میں لکھی تھی اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے :-

لنا اسیا ئیین عند خصاصة　　تکون بنا ان نلتجی بالقاصد

اس کے علاوہ مجالس النساء کی تصنیف بھی ہے - خود حالی اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ

مجالس النساء -

" لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصے کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائیڈ[1] نے ایک ایجوکیشنل دربار میں (یعنی ۱۸۷۵ء میں جب پرنس آف ویلز آئے تھے) مجھے لارڈ نارتھ بروک (وائسرائے ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۶ء) کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی . . . . "

ممکن ہے کہ اس انعام میں کارڈی صاحب کی سفارش کو بھی دخل رہا ہو - تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور میں حالی کو تعلیم کے مقاصد کے لیے ضرور مستند سمجھا جاتا تھا - اس کے ثبوت کے لیے تعلیمات کے ڈائرکٹر کے اس خط کو نہ بھولنا چاہیے جس کے جواب میں حالی نے مڈل اسکولوں کے فارسی نصاب پر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) مرزا ثریا جاہ ابن مرزا الٰہی بخش کی شادی کے متعلق ہے، وہ بھی ضمیمۂ کلیات حالی (صفحہ ۱۲۳) میں موجود ہے اور کارڈی صاحب والی عربی نظم کے بعد درج ہے۔ یہ کارڈی اس وقت لاہور میں قائم مقام ناظمِ تعلیمات تھے اور بعد میں حیدرآباد دکن میں ریزیڈنٹ مقرر ہوئے - گلستانِ سعدی کی دو حکایتوں کا عربی ترجمہ بھی غالباً اسی زمانے کی یادگار ہے -

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا) [1] ہالرائڈ کی مدح میں چھ اشعار کا ایک فارسی قطعہ ضمیمۂ کلیات میں ملتا ہے -

بحث کی ہے اور جو مکاتیبِ حالی (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۰) میں شامل ہے یہ کتاب نو ابواب یا مجالس پر مشتمل ہے جن میں عورتوں کی ضرورت کے مختلف معاشرتی مسائل کا ذکر ہے۔ علم کی اہمیت، وہ طریقے جن سے بچوں کو آسانی کے ساتھ اچھی باتیں سکھائی جا سکتی ہیں، توہم پرستی، گھر گرہستی اور زندگی کے دیگر امور سے متعلق نصائح ہیں۔ گویا وہ ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) کی طرح خواتین کی تربیت کے لیے ہے۔ انداز بیان سیدھا سادہ اور دل نشین ہے۔[۱]

اسی زمانے میں رام پور کے نواب کلب علی خاں (المتوفی ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء) کی مدح میں ایک اردو قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے حاشیے پر مولانا لکھتے ہیں:۔

— نظم کا اردو قصیدہ —

"یہ قصیدہ ۱۲۹۱ھ (یعنی ۱۸۷۴ء) میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ نواب ممدوح علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپے سال کی جاگیر ہمیشہ کے لئے مدرسے کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطور چندہ دے چکے تھے مگر مصلحتاً ان کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لئے ناتمام رہا اس کے اول اور آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہو گئے ہیں۔"

یہ قصیدہ اسی طرح ملتا ہے:۔

ظلِ حق کلبِ علی خاں جس کے بذل و جود پر
ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا

---

[۱] اس کتاب کی تفصیل اور اس پر عمدہ تبصرہ پروفیسر وقار عظیم صاحب کی کتاب "داستان سے افسانے تک" (کراچی ۱۹۶۰ء۔ صفحہ ۵۴ بعد) میں ملاحظہ ہو۔

صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں
زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیٔ بیت الہدیٰ

شاعری میں فرد، موسیقی میں فارابیٔ عصر
صوت روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا

دولتِ برطانیہ پر اس کی فرزندی کا حق
دولتِ عثمانیہ کو اس سے پیوندِ ولا

اس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس
اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا

یہ ۲۹ شعروں کا قصیدہ ہے اور کول (علی گڑھ) کے پیٹرن (مربی) ہونے کے متعلق ہے۔

کول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم
آب یاری سے ہے تیری ہی اُسے نشو و نما

مولانا حالی نے اس زمانے میں یہ قصیدہ شاید اس وجہ سے پیش نہیں کیا کہ:۔

دولتِ عثمانیہ کو اس سے پیوندِ ولا

اس قصیدے کی خصوصیت یہ ہے کہ حالی نے بے جا تعریفوں کی بجائے حقیقی اور اصلی خوبیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش قصیدے کے حق میں بے حد اہم ہے۔ کاش یہ چیز اردو ادب میں قائم ہو جاتی اور اس کے بعد عمل ہونے لگتا تو قصیدے جیسی صنفِ سخن کو زوال کبھی نہ ہوتا۔

لہ ۱۸۷۷ء میں نواب کلب علی خاں کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ بھی اسی جذبے کے تحت لکھا ہے کہ اس میں "بقدر امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے"۔

حیاتِ سعدی میں "قصائد" پر بحث کرتے ہوئے حالی کہہ چکے تھے کہ:۔

"مدحیہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہئے کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص و عام کے دل میں اس کی محبت اور اس کے ساتھ حُسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیئے کہ اگر وہ صفتیں اس میں موجود ہوں تو ان میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم ان کو اسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو ان کے حاصل کرنے میں کوشش کرے۔ یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا ان کے موجود ہونے کا احتمال ہو، ورنہ ممدوح کے دل میں اس مدح کی وقعت ایک ہجوِ ملیح سے زیادہ نہ ہوگی۔"

۱۸۷۵ء

اس کے بعد مولانا حالی لاہور سے دہلی آگئے[1]۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں کہ

"اس کے بعد (یعنی ۱۸۷۴ء والے چار مناظموں کے بعد) لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی

---

[1] غالباً وہ ۱۸۷۴ء کے آخر میں دہلی آگئے تھے کیونکہ انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے (۳۰ جون ۱۸۷۴ء) کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ . . . . لاہور سے تبدیل ہو کر دلی چلا آیا۔"

لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی چنانچہ میں نے مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں ''۔

مسدس مدوجزر اسلام تو ۱۸۷۶ء میں لکھا گیا، لیکن اس سے قبل دہلی میں بیٹھکر حالی نے اور بھی بہت سا کام کر لیا تھا۔ چنانچہ دہلی پہنچتے ہی ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے لیے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ گزٹ میں تو انھوں نے پہلے بھی لکھا تھا لیکن اب اس میں تقریظیں بھی لکھنی شروع کیں اور تہذیب الاخلاق میں مستقل طور پر خامہ فرسائی جاری کر دی، لیکن حالی کی زندگی کا یہ سال اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ان کی قومی شاعری کی بنیاد اسی سال پڑی۔ اس طرح کہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا علی گڑھ کے مدرسے کی رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔ رسم افتتاح کے موقع پر حالی نے دہلی سے جو نظم "مبارکباد" سرسید کی خدمت میں بھیجی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

مژدہ کہ وقفِ جہاں گنج سعادت ہے آج
فتنۂ ایام سے سب کو فراغت ہے آج

آج کی ایک اک گھڑی سارے برس کا ہے مول
ملک کی مخدومہ کا روزِ ولادت ہے آج

پودا لگاؤگے جو ہووے گا وہ بارور

مدینہ کی طرح ہر طرف بارشِ برکت ہے آج

مدرسۂ علم ودیں کرتے ہیں قائم ثقات

مزرعۂ قوم پر بارشِ رحمت ہے آج

رہیو مبارک سدا ساعتِ مسعود یہ

برسوں میں ہوتی وصول یاروں کی محنت ہے آج

دولتِ برطانیہ روز فزوں ہو جیو

قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج

غالباً حالی کی قومی شاعری کی بنیاد اسی نظم سے پڑتی ہے گو کہ نثر میں وہ اس سے بہت پہلے قومی موضوعات پر لکھ چکے تھے۔

۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) کے لکھے ہوئے دو مضمون مقالات حالی حصہ اول میں ملتے ہیں جو رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے تھے۔ پہلا مضمون یکم شوال والے نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کا موضوع "نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت" ہے۔ اس سلسلے میں "مبدأ و معاد" کے علم پر بحث کر کے علمِ کلام کے اس ضروری مسئلے کی تشریح کی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ اشیاء اور ان کے حقائق کے چہروں سے پردے ہٹائے ہیں اور گمراہیوں کی قلعی کھولی ہے۔ لیکن اس مضمون میں بھی اہلِ یورپ کی "برتری" کا اظہار بالواسطہ کیا ہے مثلاً ایک جگہ ضمناً فرماتے ہیں کہ:-

— دو مضامین —

"جس طرح اس زمانے میں اہل یورپ اپنے تئیں پورا شائستہ اور

اپنے سوا تمام عالم کو وحشی یا نیم وحشی خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح (قدیمی) اہلِ مصر غیر قوموں اور غیر ملکوں کو وحشی کہا کرتے تھے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سرسید کی طرح حالی بھی ہماری قوم کو غفلت سے چونکا کر اہلِ یورپ کے علوم و فنون کے لئے ترغیب دلا رہے تھے اور ایک روشن مستقبل کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی سال یکم ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کے رسالے میں ایک مضمون "جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مضمون کے موضوع سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا حالی نے قوم کو خام خیالی اور گمراہ کن "تقلید" سے بچانے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے "در مع الدہر کیف مادار" یا ع

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

سے یہ معنی لیے ہیں کہ مبارک انسان وہ ہیں جنھوں نے "گرمی میں گرمی کا سامان کیا اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا"۔ مضمون کے آخر میں حالی نے جو دعا کی ہے اس سے مضمون کا خلاصہ بلکہ حالی کی نیک نیتی بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "بار خدایا! ہماری قوم کو تقلیدِ[1] بے جا اور وضعداری بے سروپا سے نجات دے

---

[1] اقبال بھی یہی کہتے ہیں:-

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک — پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے — (پیامِ مشرق)

"تقلید" کے معنی اقبال کے یہاں قریب قریب وہی ہیں جو حالی نے لیے ہیں اور اسی کورانہ تقلید سے محفوظ رکھنے کے لیے اقبال نے حالی سے کچھ ہٹ کر فرمایا ہے:-

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اوران کو دینی و دنیوی ترقیات پر آمادہ کر، ان کا ادب اُن کو قدما سے آگے نہیں بڑھنے دیتا اوران کی وضعداری پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی...۔"

ابتدائی تنقیدیں۔ اسی سال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۸۷۵ء) میں مولانا حالی کے دو تبصرے شائع ہوئے تھے جو مقالات حالی حصہ دوم تقریظات کے ذیل میں درج ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "تقریظیں" تقریظیں نہیں ہیں بلکہ حالی کی ابتدائی تنقیدیں اور یہیں سے وہ "عملی نقاد" کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ سال ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یوں بھی وہ اسی سال سے سرسیّد کے مشن کے لیے مستقل طور پر آمادہ نظر آتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے یعنی ۱۸۷۱ء میں وہ سرسیّد کے صرف قدردان تھے جیسا کہ ان کے مضمون "سیّد احمد خاں اوران کے کام" (علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۱ء) سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۷۵ء میں حالی کی جو دو تنقیدیں شائع ہوئیں ان کا پس منظر وہی انگریزی ادب ہے جس کا بالواسطہ مطالعہ قیام لاہور کے دوران میں وہ کر چکے تھے۔ ورنہ ۱۸۷۲ء میں تو انھوں نے محض "تقریظ" لکھی تھی یعنی نواب شیفتہ کے دیوان کی "مدح سرائی" جو اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

....

....

"الا اے ہوشمندِ فرزانہ دریں روزگار کہ جنسِ بالادستِ سخن از متاعِ حسنِ خطاں ناروا تر۔ ودم گیر اے اہلِ سخن چوں نفسِ سردِ واعظاں بے اثر

افتادہ است زنہار گمان نہ بری کہ اندازۂ قدرِ گفتار را نقصان فرا گرفتہ

است و سرمایۂ لفظ و معنی بہ زیان رفتہ"۔

یہ بالکل ظہوریؔ کے طرز کی تقریظ ہے جس پر غالبؔ بھی شیفتہ تھے، لیکن جب انگریزی ادب کا (بالواسطہ) مطالعہ کیا تو اس کے ساتھ "فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی"۔ بہر حال اس پس منظر پر نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ حالیؔ نے اب "تقریظ" نہ لکھی ہوگی بلکہ کتاب کے صحیح محاسن پر تفصیل سے نہ سہی لیکن اجمالاً ضرور بحث کی ہوگی۔ چنانچہ خانبہادر شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ مرحوم کی تاریخِ ہندوستان جو سولہ جلدوں میں ہے اس کے حصۂ دوم پر مولانا حالیؔ نے اچھی خاصی بحث کی ہے۔ شروع میں مصنف اور کتاب کی قدر و قیمت بیان کی ہے، پھر جدید مغربی مستشرقین کی وسعتِ نظر کا حال آتا ہے اور قدیم تاریخوں کی "ہزاروں نکمی اور فضول" باتوں سے اس کتاب کو بالکل پاک و صاف کہا ہے۔ مولانا یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"مشرقی تاریخوں میں یہ پہلی ہی کتاب ہے جس میں یورپ کے روشن ضمیر مؤرخوں کا پورا پورا تتبع کیا گیا ہے۔ ہر ایک سلطنت کا اثر جو ملک پر یا ملک کا اثر جو سلطنت پر ہوا، اس کا بیان، ہر ایک سلطنت کے زوال یا ترقی کے اسباب، ہر ایک بادشاہ کی خصلتیں اور اس کا چلن و رویہ، ہر موقع پر بہ حسب ضرورت رائے لگانی اور اس میں تعصب اور طرفداری کو دخل نہ ہو، اس کتاب کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی چھینٹ تک

ہمارے ملک کی تاریخی کتابوں پر نہیں پڑتی . . . . ‘‘

اس تبصرے میں حالی جگہ جگہ مصنف کی صداقت اور اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے عام ہندوستانی تاریخوں کے عیوب بھی گناتے جاتے ہیں اور پوری کتاب کا تجزیہ کر کے اس کے محاسن بھی بیان کرتے ہیں۔

اس تبصرے میں بھی حالی اہل یورپ سے صحیح معنی میں مرعوب نظر آتے ہیں، لکھتے ہیں کہ :-

’’ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی تاریخ اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں آئی کہ جس کو وہ چاہیں آسمان پر چڑھائیں اور جس کو چاہیں تحت الثریٰ تک پہنچا دیں۔ اب اس تاریخ کی مالک وہ قوم ہے جس کے آگے بغیر حجت و دلیل کے کسی کی تعریف یا تنقیص پیش نہیں چل سکتی‘‘۔

حالی کے اس قول میں جس حد تک صداقت موجود ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اہل یورپ نے ’’حجت و دلیل‘‘ کے ساتھ ساتھ جس فتنہ پردازی کے لیے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی ہے اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے؟

اسی سال حالی نے عرب سرائے کی علمی سوسائٹی کی فرمائش پر ٹیونس کے وزیر خیر الدین کی عربی تاریخ ’’اقوام المسالک‘‘ پر (جو یورپ کے متعلق ہے) تبصرہ کیا تھا لیکن مولانا حالی نے صرف اردو ترجمہ دیکھا تھا انھوں نے پہلے کتاب کی ظاہری تفصیل دی ہے۔ پھر اس کے مقدمے کی تعریف کی ہے جس کا ایک ایک جملہ بقول ان کے ’’ناصح مشفق اور ہادی برحق کا کام دیتا ہے‘‘۔ کیونکہ

"اس میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جب کسی غیر مذہب قوم میں کوئی اچھی خصلت یا مفید بات پائی جائے اور لسان شرعی اس کی تقبیح سے ساکت ہو تو ہم کو صرف اس خیال سے کہ ہمارے غیر مذہب والوں میں یہ بات پائی جاتی ہے اس کے اخذ کرنے میں ہرگز تامل کرنا نہیں چاہئے"۔
اس کے بعد اس مقدمے میں خود مختاری اور شخصی حکومت کے بُرے نتائج اور جمہوری اور محدود الاختیار سلطنتوں کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں حالی نے مصنف کے ان تمام خیالات کو سراہا ہے اور اسی سلسلے میں لکھا ہے کہ

"ہمارے ہم وطنوں نے آنکھ کھول کر ایک آزاد گورنمنٹ کے
سوا کچھ نہیں دیکھا اور شخصی حکومت کے جور نہیں اٹھائے،
اس لئے امید کی جاتی ہے کہ وہ اس مضمون کو دیکھ کر انگریزی
گورنمنٹ کی قدر کما حقہٗ پہچانیں گے اور جو دولت (یعنی آزادی)
خدا تعالیٰ نے ان کو بن مانگے دے رکھی ہے اس کا شکریہ
تہِ دل سے ادا کریں گے"۔

غرض کہ اس مقدمے سے حالی کو سرسید والے مشن کے لیے تائید حاصل ہوئی اور خیالات کی ہم آہنگی نے خود حالی کے انداز بیان کو تقویت بخشی۔
خیر الدین کی اصل کتاب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ مولانا حالی نے اس کے مختلف موضوعات کی فہرست دے کر ان کی افادیت پر بحث کی ہے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے یہ کتاب ہدیتہً مجلس خزینۃ البضاعت کو عنایت کی تھی اور اس مجلس کے سکریٹری

یعنی سید احمد خاں کا شکریہ بھی ادا کیا ہے جنھوں نے اس کتاب کی افادیت کی خاطر اپنے اخبار کے ذریعے "قوم کے دلوں کو اس کے مطالعے یا اشاعت کی طرف مائل کیا۔" بعد میں خلیفہ سید محمد حسن خاں (وزیر اعظم ریاست پٹیالہ) کا شکریہ بھی ہے جنھوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ مولوی محمد اسمٰعیل سے کرایا تھا۔ حالی نے اپنے تبصرے کے آخری حصے میں مولوی محمد اسمٰعیل کے ترجمہ پر بھی تبصرہ کیا ہے یعنی جہاں تک ترجمہ کی خوبیاں یا خامیاں ہیں ان کو بیان کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ "زمانہ حال کی عربی کا ترجمہ کرنا ایک ایسا دشوار کام ہے جس سے عہدہ برآ ہونا محال ہوتا ہے، علی الخصوص جب کہ زمانۂ حال کی عربی میں کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جو سرتاپا مغربی خیالات سے بھری ہو۔ (اس) عربی میں ہزاروں لغات مولدہ ایسے شامل ہو گئے ہیں جن کا صحاح و قاموس و صراح میں کہیں پتا نہیں۔" ترجمے کی خامیوں کے متعلق صرف اتنا کہا ہے کہ "آدمیوں اور مقامات اور جزائر وغیرہ کے بیشتر نام جو اس ترجمے میں لئے گئے ہیں وہ (تعریب کی وجہ سے) ناظرین کو نہایت تشویش میں ڈالتے ہیں۔" سوائے اس جملے کے حالی نے کوئی اور بات ترجمے کے متعلق نہیں لکھی اور ضرورت بھی نہیں تھی، لیکن حالی کی "تنقید" کی ابتدا ضرور یہیں سے ہوتی ہے جب کہ انھوں نے کتاب کے حسن و قبح دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالی تھی۔

۱۸۷۶ء

اب مولانا حالی قریب چالیس سال کے ہو چکے تھے، سنجیدگی تو پہلے ہی سے

تھی اب اور پختگی ہو گئی تھی۔ لوگوں کو ان کی اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف تھا۔ دہلی میں ۲۱ اپریل ۱۸۷۶ء میں "دہلی سوسائٹی" کے ایک عظیم الشان جلسے میں حالی کا اک لکچر "ہمدردی" پر ہوا تھا جو بہت مقبول ہوا یہ مضمون "ہمدردی" کے فلسفے پر ہے اور مختلف مثالوں سے اس کی تشریح ہے۔ مصلحتِ وقت کی بنا پر انگریزی حکومت کی بالواسطہ اور بلاواسطہ تعریف کی گئی ہے۔ مثلاً

—ہمدردی پر لکچر—

"ہم کو بھی ہماری گورنمنٹ طرح طرح سے ہمدردی کی تعلیم دے رہی ہے۔ قومی ہمدردی کا بڑا سرچشمہ، سررشتۂ تعلیم ہے، کیونکہ اس کے سبب سے بے شمار لڑکوں کو ایک معقول مدت تک باہم میل جول رکھنا پڑتا ہے۔ ...... اس کے سوا گورنمنٹ کا یہ اصول کہ جو چندہ علوم یا فنون کی تعلیم کے لئے رعایا کی طرف سے فراہم ہو اسی کی برابر گورنمنٹ کی جانب سے امداد کی جائے۔ ہم کو زبردستی اس بات کی طرف کھینچتا ہے کہ تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر گرانٹ اِن ایڈ کا استحقاق حاصل کریں اور اپنے ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں میونسپل کمیٹیاں جو سرکار نے جابجا شہروں اور قصبوں میں قائم کی ہیں۔ .... یہ بھی ہمدردی کے اچھے نمونے ہیں۔ علمی یا قومی سوسائٹیاں جن کی بنیاد صرف انگلش گورنمنٹ کے پرتو ہندوستان میں پڑی ہیں، اگر ان میں کچھ جان ہو اور فقط دھوکے کی ٹٹیاں نہ ہوں تو وہ سرچیون چشمے ہیں جن سے تمام ملک

سیراب ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایک اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم جو ہماری خوش قسمتی سے ہم پر حکمراں ہے اس کا چال چلن، اس کے اخلاق، اس کا طریق معاشرت، اس کے علوم و فنون، اس کی دانشمندی، اس کی تہذیب، اس کے نئے نئے ایجادات جو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جب ان باتوں کو اپنے ملک کی موجودہ صورت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ضرور ہے کہ ہم کو اپنی ہم وطنوں کی نہایت وحشیانہ حالت پر افسوس آئے اور ہمدردی کا جوش ہمارے دلوں میں موجزن ہو۔"

حالیؔ کے یہ الفاظ بظاہر انگریزی حکومت کی خوشامد میں ہیں، لیکن جو اوصاف انھوں نے اس قوم کے گنائے ہیں کیا ان کی حقیقت میں بھی کوئی شک ہے؟ اور کیا اُنہیں اور اُن جیسے اوصاف ہماری قوم میں اب بھی موجود ہیں؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم نے اپنی خوبیاں بھی چھوڑ دیں اور انگریزوں کے اوصاف سے بھی قطع تعلق رکھا (حالانکہ کسی قوم یا ملک کی خوبیاں اختیار کرنے کی ممانعت بھی نہیں ہے بلکہ شریعت سے ترغیب ثابت ہے) ہم نے اتنا ضرور کیا کہ انگریزوں کی برائیاں اور بے حیائیاں ضرور اختیار کر لیں کیونکہ ان کے اختیار کرنے میں آسانی بھی تھی اور کسی "خونِ دل و جگر" کے سرمائے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حالیؔ نے پھر بھی حق گوئی سے کام لے کر اس مضمون میں کہا ہے کہ :-

"انگریزی رائیں غلط نہیں تو اکثر ان میں سے ایسی ہیں جو بالفعل عام رایوں اور عام خواہشوں کے برخلاف معلوم ہوتی ہیں اور اسی سبب سے جن لوگوں کی بہبودی کے لیے وہ کی جاتی ہیں اکثر وہی ان میں رخنہ انداز ہوتے ہیں اور تقریباً تمام قوم ان میں ہار دینے

سے انکار کرتی ہے۔" حالی نے اس کے لیے حل بھی بتائے ہیں۔"

۱۸۷۷ء

سرسیّد کی مدح میں قصیدہ:

۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد پڑی تھی۔ سرسیّد سے حالی کو عقیدت پیدا ہو چکی تھی اور وہ ان کے جوشِ عمل سے بہت متاثر تھے۔ اس لیے اُن کی مدح میں ایک قصیدہ اسی زمانے میں شروع کیا تھا جب کہ کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی لیکن وہ ناتمام ہی رہا۔ اس قصیدۂ ناتمام (مرقومہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء) کے حاشیے پر مولانا لکھتے ہیں کہ:-

"یہ قصیدہ اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سرسیّد کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے، مگر بہ سبب مکروہاتِ دُنیوی کے پورا نہ ہو سکا۔"

یہ ناتمام قصیدہ صرف تیرہ اشعار پر مشتمل ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:

پنہاں نہیں ہے یارو سب پہ کھلا ہوا ہے — جو حال آج اپنا اور اپنی بزم کا ہے
ہے اک کبیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم — خود سانپ دُنیا سے کب کا نکل گیا ہے
اس پر بھی اے عزیزو ہے جائے فخر تم کو — دِینوں میں دینِ بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

سرسیّد کے حقیقی اوصاف نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں حالی نے اس

طرح بیان کیے ہیں :-

اس دورِ آخری میں جب یُوں بگڑ چلے تم — اِک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے
سر سبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں — فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا، کام اپنا، جان اپنی، مال اپنا — یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے — قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

نئے طرز کا فارسی قصیدہ :

یہ قصیدہ ۱۸۷۶ء[۱] کا ہے اس میں بھی حالی نے صرف حقیقی اوصاف بیان کیے ہیں اور صنف قصیدہ کو بے جا مبالغوں سے پاک رکھا ہے۔ اس چیز کی بنیاد وہ ۱۸۷۴ء میں ڈال چکے تھے جبکہ نواب کلب علی خاں مرحوم کی مدح میں اُردو قصیدہ لکھا تھا۔ اب اس سال یعنی ۱۸۷۶ء میں انھوں نے نواب موصوف کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا جو انہی اوصاف کا حامل ہے۔ وہ اس قصیدے کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں کہ :-

"اِس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ شاعرانہ خیالات میں پہلے پہل ہی انقلاب پیدا ہُوا تھا اور مبالغے سے نفرت ہونے لگی تھی انہی دنوں میں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا۔ جی میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے

۱ے ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) اور ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۸۷۷ء) کے لکھے ہوئے بعض تاریخی قطعات، ضمیمہ کلیات اردو۔ ص ۴۹-۵۱ وغیرہ میں موجود ہیں۔

کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بہ قدر امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے۔
چونکہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انھوں نے سرسیّد کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور دربار میں ان کے شریک ہونے کی قوی اُمید تھی۔ اس لیے انہی کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا۔"

مولانا حالی گویا فارسی قصیدے میں بھی صرف حقیقی اوصاف لکھنے کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے حالانکہ وہ اردو قصیدے میں حقیقی اوصاف لکھنا شروع کر چکے تھے اور مبالغے سے پرہیز کرنے لگے تھے یہ فارسی قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

سحر گہ پردہ بگرفتند چوں از زشت وا از زیبا ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ بہ دل گفتم کہ ایں نعمت آمد بہ تراز نعما
بگفتا نعمتے و رتہ از ہم بیش و کم نبود ‌‌‌‌ زساقی عین رحمت داں اگر جرعہ و گر مینا
و لے فرماں وہ بیدار دل زیں اصل مستثنیٰ است ‌‌‌‌ کہ چوں او نعمتے نتواں نشاں وا دا نیٔ دنیا

یعنی صرف دو شعر کے بعد ہی گریز شروع کر دیا ہے اور یہ گریز بظاہر ایک عام "بیدار دل حکمراں" کے متعلق ہے کہ اس میں کیا کیا اوصاف ہوا کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام اوصاف ایک خاص ممدوح یعنی نواب کلب علی خاں کے بارے میں ہیں۔ بہر حال گریز کے بعد ۲۲ شعر اس بیدار دل حکمراں کے اوصاف میں ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

اگر خواہی جہاں را ایں چنیں بیدار دل بینی ‌‌‌‌ بیا در خیمہ گاہِ دیں پناہِ خسروِ والا

گویا حالی نے گریز در گریز قائم کیا ہے۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں کے اوصاف کے متعلق کچھ اور اشعار ہیں اور مصطفیٰ آباد (رام پور) کے اہلِ کمال

کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ پھر ایک فرضی شخص سے خطاب ہے جو دربار ی رئیسوں اور سرکاری مہمانوں کے خیموں کو دیکھ کر واپس آرہا ہے۔

تو اے کز سیر ہنگاہ سران ہند می آئی | چہ آوردی بگو از جنس معنی ارمغاں مارا
گرفتم دیدۂ از ملک و دولت بہرہ ور جمعے | دے کم دیدہ باشی علم و دولت را بہم یک جا
کشادستند پر دے ہوا صد طبلہ عطاراں | مشامے کو کہ دریا بد نسیم عنبر سارا

اور اپنے ممدوح کو حالی کچھ اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ :-

بہ گلشن جلوۂ ہر لو نہالے دیدنی دارد | دے در خاطر بُلبل نہ گنجد جز گل رعنا

اس کے بعد کچھ اور اشعار موقع و محل کے لحاظ سے ہیں اور دعائیہ پر قصیدہ ختم کر دیا گیا ہے۔

یہ قصیدہ مولانا حالی نے بڑی عقیدت کے ساتھ لکھا تھا لیکن نواب صاحب اپنی بیماری کی وجہ سے دلّی کے دربار میں نہ جا سکے۔ اس دربار کے انعقاد کے بعد ہی ۸ رجنوری ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن اور ان کی بیوی دونوں علی گڑھ آئے اور مدرستہ العلوم کی بنیاد رکھی۔

زمزمہ قیصری :

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مولانا حالی نے ۱۸۷۶ء میں اپنے لکچر "ہمدردی" میں انگریزوں کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں اور وہ بادی النظر میں خوشامد کے انداز میں ہیں لیکن جب ۱۸۷۷ء میں مولانا نے اپنی نظم "زمزمہ قیصری" لکھی تو اس کے حاشیے پر انگریزوں کی "ہمدردی" کی قلعی کھول دی ہے اور حق گوئی اس طرح کی ہے :-

"انگریزی مؤرخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ کریں اور مسلمانوں پر غضب ناک اور برافروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب (نمک) چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں مسٹر اسٹوک ایک انگریز مصنف نے دربار قیصری منعقدہ ۱۸۷۶ء (پہلی جنوری ۱۸۷۷ء؟-) کے موقع پر ایک انگریزی نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی ابتدا اور ترقی کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں ان ہندوستانی رؤساء اور والیانِ ریاست کا تذکرہ ہے جو دربارِ قیصری میں شریک ہوئے تھے۔ پہلے حصے میں مصنف نے بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی کی ہے۔ اسی طرح ایک اور انگریز محمود (غزنوی) کے متعلق کچھ اشعار نظم کیے ہیں (جن میں اس کے ظلم اور غارت گری کا حال ہے) لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہاں کی شائستہ قومیں جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بمراتب زیادہ وحشت و خونریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں۔"

اس کے بعد مولانا نے یورپ وغیرہ کی مختلف قوموں کے وحشیانہ سلوک کا ذکر کیا ہے اور آخر میں ایک جگہ اس طرح چٹکی لی ہے کہ "اگر ہمیں آزادی

تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور اخیر جبر و تعدّی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم بھی سدِ راہ کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادی تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے۔ حالانکہ آج تک پولیٹیکل اکانومی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ کا قاعدہ مطلقاً قرینِ انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلافِ انصاف بھی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے[1]"

مسٹر اسٹوک نے دربارِ قیصری کے انعقاد پر جو انگریزی نظم لکھی تھی اس کا فارسی ترجمہ (دلّی کے کمشنر کرنل ڈیوس کے توسط سے) بعض لوگوں سے کرایا تھا اور انگلستان میں اسے چھپوایا تھا۔ کرنل ڈیوس نے مولانا حالی سے اس کا اردو ترجمہ کرنے کی فرمائش کی تھی، لیکن کچھ دن کے بعد فارسی کے لیے فرمائش کی۔ مولانا اس وقت علیل تھے اس لیے فارسی میں ترجمہ تو نہیں کر سکے، البتہ اس نظم کے پہلے حصے کا جو اُردو ترجمہ کیا تھا اس کو "ترکیب بند" کی شکل میں "زمزمۂ قیصری" کے نام سے ۱۸۷۷ء میں پیش کیا تھا۔ اس حصے میں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، ہندوستان اور یہاں کے مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی نشو و نما کا ذکر ہے۔ یہ ترکیب بند اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

اے حصارِ عافیت، اے کشورِ ہندوستان　　　زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں

اس میں ۳۶ بند ہیں اور بڑی احتیاط کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی جہاں کوئی

---

[1] مقالاتِ حالی حصہ اوّل ۔ مدعیانِ تہذیب کی بد اعمالیاں ۔

لفظ بڑھایا ہے یا نظم کے کسی بند میں، فن کے لحاظ سے کوئی شعر اضافہ کرنا پڑا ہے تو اسے قوسین میں لکھ دیا ہے۔ اکبر کا ذکر بالکل اسی انداز سے ہے جس طرح انگریزوں کے عہدِ حکومت میں ہم نے تاریخ میں پڑھا تھا۔ یعنی

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نامدار — صلح کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار
بس کہ آزادی بنی نوعِ بشر کو تو نے دی — رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدت کا مدار
فہم سے بندوں کے بالاتر تھے جو اسرارِ دیں — بحث کرنے کا ملا بندوں کو ان میں اختیار
حوصلہ نکلا ترا شاہانِ پیشیں سے وسیع — تجھ سے القابِ شہنشاہی نے پایا اعتبار
پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف — ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا ان کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا ان کے تعصب کا انہیں — کر گیا رحلت جہاں سے جلد اُن کا اقتدار

خار و خس کے ڈھیر ہیں کھنڈروں میں ان کے آج واں
دولت ، روئے زمیں کل جلوہ آرا تھی جہاں

حالی کو آج لوگ انگریزوں کا خوشامدی کہتے ہیں لیکن اگر ہم اس نظم کے مختلف حواشی دیکھیں اور خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ (قولاً نہ سہی، لیکن عملاً) ہم ان سے زیادہ خوشامدی ہیں۔ اس نظم میں شروع سے آخر تک تشریحی فوائد اور تنقیدی حواشی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ نہ صرف حالی کی حق گوئی بلکہ عملی وسیع النظری پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

سنہ ۱۸۷۹ع

پانچ مضامین:

اس کے بعد سنہ ۱۲۹۶ھ (مطابق سنہ ۱۸۷۹ء) شروع ہوتا ہے۔ یہ سال مولانا حالی کی علمی مصروفیات کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ جتنا کام انھوں نے اس سال کیا اتنا کبھی نہیں کیا۔ ذہنی، مذہبی، علمی، سیاسی اور مختلف قسم کی قومی خدمات اسی سال انجام دیں اور اسی سال اپنی لافانی یادگار "مسدس" بھی قوم کے لیے پیش کی۔ اس سال چار مضمون (الدین یسیر۔ بدگمانی، تدبیر اور مزاح) انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع کرائے اور ایک مضمون "مدرستہ العلوم" (علی گڑھ) پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اسی سال شائع ہوا۔ پہلا مضمون "الدین یسیر" بہت طویل ہے۔ اس کا خلاصہ اتنا ہے کہ "یہ دین انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اس کو دشوار بات کے کرنے یا ماننے پر مجبور نہیں کرتا۔ چنانچہ مولانا حالی نے پہلے قرآن اور احادیث سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے پھر یہ لکھا ہے کہ:

"اس دین میں "کوئی چیز انسان کی واجبی امنگ اور خوشی اور آزادی کو روکنے والی نہ تھی" لیکن بعد کے لوگوں نے اس پر مختلف حاشیے چڑھائے۔ پہلا حاشیہ یہ تھا کہ جو باتیں محض اصلاحِ معاش کے لیے بتائی گئی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالحِ دنیوی پر تھا وہ بھی ضروریات دین میں سے سمجھی جانے لگیں۔ دوسرا حاشیہ یہ چڑھایا گیا کہ اعمال

بدنی اور احکامِ ظاہری کے لیے سخت پابندی کا حکم لگا دیا گیا۔ چنانچہ "عاجز بندوں کو ایسا شکنجے میں کھینچا کہ ان میں دُنیا کے بڑے بڑے کام کرنے کا دم باقی نہیں رہا۔ تیسرا حاشیہ یہ چڑھا کہ بعض واعظوں اور خود غرضوں نے "اعمالِ ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لیے سیکڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کر لیں"۔ چوتھا حاشیہ یہ چڑھایا کہ "مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابلِ نفرین کام انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا"۔[1] پانچویں حاشیے کے متعلق حالی نے لکھا ہے کہ مذہبی تعلیمات کو لوگوں نے محض حسنِ عقیدت یا وجدانی شہادت سے قبول کیا تھا۔ اس لیے فلسفیوں کے ان مقالات سے وہ بہت متاثر ہوئے جو دین کے مقابلے میں بظاہر زیادہ مدلّل معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ "متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے . . . . پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا اصل جزو قرار دیا گیا"۔ چھٹا حاشیہ بدعات اور رسوم و تقلید کا تھا جو دین سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا۔ یہاں مولانا حالی نے بالکل سرسید کے انداز میں دُکھتی رگ کو چھیڑا ہے اور بدعات کے معائب کو سب سے زیادہ فضول اور لغو کہا ہے۔ اس

---

[1] اسی موضوع پر نواب محسن الملک نے بھی رسالہ تہذیب الاخلاق میں حالی سے پہلے لکھا تھا اور سرسید نے بھی یکم محرم ۱۲۸۹ھ (۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء) کے رسالے میں لکھا تھا۔

مضمون میں بھی حالی نے یورپ والوں کی ایک صفت حق پسندی کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے ہمارے معائب والے اسلام کو اسلام نہیں کہا بلکہ "انھوں نے اپنی نہایت گہری نگاہ سے اس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کر کے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور صرف اسی پر اپنی رائیں لکھی ہیں۔"

حیاتِ جاوید کا ایک اجمالی خاکہ :

اس کے بعد مضمون "بدگمانی" ہے جو اسی سال چھپا تھا۔ اس کا پس منظر سر سید اور ان کے رفقائے کار کے متعلق بدگمانیوں اور شکایتوں کا طومار ہے۔ کیونکہ اسی زمانے میں وہ بہت زیادہ مطعون تھے۔ مولانا حالی نے سر سید کی حمایت میں تمام پیش آئے ہوئے حالات پر اشارۃً، کنایۃً تبصرہ کیا ہے اور ان کی بے لوث خدمات کا بالواسطہ جائزہ لیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ انھوں نے اس مضمون[۵۰] میں اجمال اور اختصار کے ساتھ جو کچھ سر سید کے متعلق کہا ہے اس کی تفصیل بعد میں حیاتِ جاوید میں نظر آتی ہے۔ اور قوم کی زبوں حالی کا جو دکھڑا حالی نے اس مضمون میں رویا ہے وہی اس کے بعد والے مضمون "تدبیر" میں بھی نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے قرآن اور حدیث کے متعدد حوالے دے کر "تدبیر" کے لیے ترغیب دلائی ہے اور بڑی منطقیانہ بحث کی ہے۔ اس کے بعد کامیابی کے لیے (۱) محنت (۲) علم اور (۳) ہنر کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے ضمن میں اوہام پرستی کے خطروں سے بھی

[۵۰] حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں بھی انھوں نے لکھا ہے کہ "راقم کو سرسید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جا رہا تھا اور اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سرسید کی دلنشین تحریریں جیسی کہ اردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں شائع ہو رہی تھیں۔"

آگاہ کیا ہے اور قومی فلاح و بہبودی کے لیے مشورے دیے ہیں۔ اس کے بعد والے مضمون میں "مزاح" پر بحث ہے۔ ابتدائے اسلام سے لے کر نواب سعادت علی خاں اور محمد شاہ کے زمانے تک مختلف قسم کے مزاح کا مختصر تذکرہ ہے جس سے حالی کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ اسی کے ساتھ قوم کے پست اخلاق کی وجہ سے مزاح کے پست معیار ہو جانے کا ذکر بھی آتا ہے۔ ہنسنے ہنسانے کے علاوہ دل دکھانے اور بے حیائی کی باتوں کو جس طرح "مزاح" کے تحت، محمود و مقبول سمجھا جاتا ہے اس پر بھی بحث آتی ہے۔ اور "پنچ اخباروں"[۵] کی "ظرافت" کی حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے۔ آخر میں سر سید کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ "ہماری قوم کے بعض ریفارمر جو کبھی کبھی مزاح کے پیرائے میں کوئی مضمون لکھتے ہیں، گو وہ بالفعل ناعاقبت اندیشوں کو ناگوار گزرتے ہیں لیکن بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ان کی نہایت تعظیم کی جائے گی اور ان کے دل دوز فقرے اور دل شکن طعنے شفیق اُستاد کی زد و کوب سے زیادہ قدر کے لائق سمجھے جائیں گے۔"

علی گڑھ میں آمد:

اسی سال یعنی ۱۸۷۵ء میں مولانا حالی پہلی بار علی گڑھ گئے اور مدرستہ العلوم اور اس کے حامیوں کو دیکھا۔ ان سب کو دیکھ کر وہ جن تاثرات کو لے کر دہلی واپس

---

[۵] یہ انگریزی "پنچ" اخباروں کے متعلق کہا گیا ہے۔ اس کے بعد سے لکھنؤ کا "اودھ پنچ" ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔

ہوئے تھے ان کا اظہار ایک مضمون "مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ" میں کیا تھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (بابت ۱۸۷۹ء) میں چھپا تھا۔ مضمون کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

" ان دنوں حسنِ اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے مدرسۃ العلوم کا احاطہ بہت قریب تھا اور یہ پہلا ہی موقع مدرسۃ العلوم کو دیکھنے کا ملا تھا۔ اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی مگر جس قدر مدرسے کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی اس سے بھی جو اثر ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔"

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ عقیدت مند لوگ ہی ایسے موقع پر اتنے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں جب کہ مدرسہ بھی بند تھا اور طلبہ بھی بہت کم تھے لیکن عقیدت مند ہونے کے علاوہ ایک حقیقت بیں شخص اگر نظیری کی طرح یوں کہہ سکتا تھا :-

ایں کعبہ را بنا نہ بہ باطل نہادہ اند   صد معنی و جمال دریں گل نہادہ اند

تو وہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تو دیکھتا تھا کہ "خدا نے اپنا کام لینے کے لیے اس (سرسید) کو کچھ یار و مددگار بھی دیے ہیں۔ جن میں سے بعض (یعنی نواب وقارالملک) نے اپنا گھر بار چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں بود و باش اختیار کر لی ہے اور اکثر اپنے اپنے مقام پر دل و جان سے اعانت و امداد میں سرگرم ہیں" ایسے مخلص لوگوں کے سامنے کوئی مقصد ضرور صداقت پر مبنی تھا ورنہ کسے کیا پڑی تھی کہ آ کے یہ دردِ سری اٹھاتا ؟ مولانا حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ :-

"ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی عام تدبیر مسلمانوں کی دینی اور دُنیوی بہبودی کی اُس وقت سے جبکہ مہلب (سنہ ۴۴ھ میں) اور محمد بن قاسم (سنہ ۹۳ھ میں) نے اس ملک میں قدم رکھا آج تک (سوائے اس کے) نہیں کی گئی۔"

ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حالیؔ نے اس سال نہ صرف ادب کے لیے بلکہ قومی فلاح وبہبودی کے لیے مسلسل مضامین لکھے کیونکہ "سرسید تحریک" کی تائید میں گو کہ انھوں نے سنہ ۱۸۷۰ء سے لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن اس سال انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس تحریک کی عملی تصویر بھی دیکھ لی تھی۔ چنانچہ سرسید کی ملاقات جادو کا اثر کر گئی اور حالیؔ نے اپنی ادبی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اسی سال اسی پیرمرد کی تحریک پر قوم اور ملک کے سامنے پیش کیا اور نثر کے علاوہ نظم کو بھی اس نے قومی جذبے سے نوازا۔

مُسدّس :

سنہ ۱۸۷۹ء[لہ] میں مسدس شائع ہوا، اس وقت سے لے کر اس وقت تک اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید اردو کی رہتی دُنیا تک اس کے متعلق ہمیشہ لکھا جائے گا۔ اس لیے سرسید کا وہ یادگار خط یہاں نقل کرنا بہتر ہوگا۔

لہ اسی سال حالیؔ نے باشندگانِ دہلی کی طرف سے وائسرائے کے نام ایک "ایڈریس" بھی لکھا تھا جو مقالاتِ حالیؔ حصہ دوم میں موجود ہے اور جو افغانستان کی جنگ میں انگریزوں کی فتح کی تہنیت پر ہے۔

جس میں اس مسدس پر مختصر لیکن جامع تبصرہ ہے۔ سرسید کو جب مسدس کے نسخے ملے تو لکھتے ہیں :۔

" جناب مخدوم و مکرم من۔ عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوڑی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور مؤثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ و نئی ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ جو اشارہ اس نثر میں ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بُو اس میں پائی جاتی ہے تو وہ صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بیشک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تُو کیا لایا ہے؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس

لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں - خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے - مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں - آپ کے اس خیال کا کہ حقِ تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کروا دی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں - مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور جو ان کی تاریخ کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقیّد کیا جاوے - جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گایا کریں اور رنڈیاں مجلسوں میں سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی - میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں - مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں - میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا - میرے ان استفسار کا جواب جن پر سرخ نشان کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔"

والسلام

آپ کا احسان مند و تابعدار

سید احمد[1]

شملہ پارک ہوٹل، ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء

---

[1] سر سید کا یہ خط علی گڑھ میگزین (جنوری ۱۹۳۹ء) میں بھی ہے۔

مسدس جیسے عظیم الشان کارنامے کے متعلق جتنا لکھا جائے کم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں مشرق میں اس پائے کی کوئی نظم نہیں لکھی گئی۔ اس میں حسن و عشق کے معرکے یا تشبیہات و استعارات کی بو قلمونی وغیرہ کچھ نہیں ہے "از دل خیزد و بر دل ریزد" ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اس لیے فصاحت و بلاغت کے ظاہری خد و خال نہ ہونے کے باوجود وہ بہت فصیح اور نہایت بلیغ ہے اور حالی کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لیے کافی ہے[1]۔

ایک ترکیب بند:

اسی مسدس مد و جزر اسلام کے سلسلے کی دوسری کڑی ایک "ترکیب بند" ہے جو دوسرے سال یعنی ۱۸۸۰ء میں "مدرسۃ العلوم مسلمانان، واقع علی گڑھ" کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں[2]

---

[1] مسدس کے بعض ماخذوں کی نشاندہی، مقالاتِ شیرانی (کتاب منزل، لاہور) میں ہے۔ مسدس پشتو ترجمہ غلام محمد خاں نے کیا تھا جن کا ذکر کئی جگہ مکتوبات حالی میں آیا ہے۔ مسدس میں کئی بند ایسے شاعری کی عام خرابیوں سے متعلق ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ مسدس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ پہلا اور دوسرا ایڈیشن بغیر ضمیمہ کے تھا۔ تیسرا ایڈیشن جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا اس میں کہیں کہیں تصرف بھی کیا تھا اور اس میں پہلی بار ضمیمہ شامل کیا تھا (تذکرۂ حالی از شیخ محمد اسمٰعیل صفحہ ۹۷)

[2] غالباً یہ ترکیب بند مولانا حالی نے علی گڑھ ہی میں پیش کیا تھا۔ یعنی جبکہ وہ علی گڑھ میں دوسری بار تشریف لے گئے تھے۔

چار چار شعر کے گیارہ بند ہیں یعنی کل ۴۴ شعر ہیں اور نہایت سلیس زبان میں علی گڑھ کے اوصاف اور مقاصد بیان کیے ہیں۔ اس کی ابتدا انتہائی سلاست اور برجستگی کے ساتھ ہوئی ہے:۔

جھُٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا ایک بڑھیا نے سرِرہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے ہے اندھیرا گھُپ در و دیوار پر چھایا ہُوا

سُرخ رُو آفاق میں وُہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اس ابتدائی بند میں سرسید اور ان کے مدرستہ العلوم کی اصل قدر و قیمت بیان کی ہے اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت یعنی تعلیم پر آگے بھی بحث کی ہے۔ دوسرا بند اس طرح ہے:۔

ہم نے ان عالی بناؤں سے کیا اکثر سوال آشکارا جن سے اگلے بانیوں کا ہے جلال
شان و شوکت کی تمھاری دھوم ہے آفاق میں دُور سے آآ کے تم کو دیکھتے ہیں باکمال
قوم کو اس شان و شوکت سے تمھاری کیا ملا؟ دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال
سرنگوں ہو کر وہ سب بولیں زبانِ حال سے ہو سکا ہم سے نہ کچھ الا انفعال الا انفعال

بانیوں نے تھا بنایا اس لیے گویا ہمیں
ہم کو جب دیکھیں خلفِ اسلام کو رویا کریں

اس بند کو دیکھ کر سرسید کی وہ تقریر یاد آجاتی ہے جو انھوں نے دسمبر ۱۸۷۳ء

میں (جب کہ حالی بھی تھے) لاہور کے شالامار باغ میں کی تھی جس کے تختِ شاہجہانی پر سرسید کے ایک ساتھی چڑھ گئے تھے اور سرسید متاثر ہو کر یوں گویا ہوئے تھے کہ :-

"اے دوستو! تم جانتے ہو کہ اس وقت تم کہاں کھڑے ہو۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس کے آس پاس دُور دُور تک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اور اب تم دیکھو کہ وہ کس حالت میں ہے۔ مگر اب تم سمجھو کہ یہ حالت اس کی کیوں ہو گئی ہے۔ صرف اس لیے کہ یہ کام ایک بادشاہ کا ذاتی کام تھا اور اس کو ذاتی غرض، ذاتی آرام کے لیے بنایا گیا تھا۔ اگر یہ قومی کام ہوتا اور تمام قوم کے عام فائدے کے لیے بنایا گیا ہوتا تو کبھی ایسی ذلت کو نہ پہنچتا۔ بلکہ جتنا زمانہ اس پر گذر جاتا اس کی عزت بڑھتی جاتی۔"

اسی تقریر کا پرتو تیسرے بند میں موجود ہے فرماتے ہیں :-

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ اک شاندار — اور چھوڑا اس نے اک ایوانِ عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے — ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار
اک محبِ قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے — قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہو گی عالم میں کہو، سرسبز یہ پھلی مراد — یا وہ اگلوں کی امیدیں لائیں گی کچھ برگ و بار

چوتھے بند کے دو شعر بھی اہم ہیں :-

دُور سے اُمید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے — ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے
قوم کے پیر و جواں سب ہو گئے تھے مردہ دل — دردمندی جوش میں چند اہلِ دل کو لائی ہے

بہت ممکن ہے کہ اس ڈوبتی کشتی کی تشبیہ سے سر سید نے وہ تصویر نواب مختار الملک مرحوم کے لیے بنوائی ہو جس کا ذکر حیاتِ جاوید میں آتا ہے کہ سر سید، سمندر کے کنارے درخت سے کمر لگائے فکرمند کھڑے ہیں۔ سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔ جہاز کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور مسافر ڈوب رہے ہیں۔ اتنے میں ایک کشتی بچانے کے لیے جہاز کی طرف پہنچ گئی۔ اس کی جھنڈی کے پھریرے میں انگریزی حروف میں "ایک لاکھ روپیہ" لکھا ہوا تھا۔ سر سید نے اُسے ناکافی کہا۔ تو فرشتہ آسمان سے اُترا اور اس نے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کیا۔

بہرحال قوم کی حالت اور سر سید کی خدمات کے متعلق اس ترکیب بند میں ذکر ہے اور نہایت مؤثر انداز میں جذبات نگاری کی داد دی ہے۔ آخری دو بند اسی مدرستہ العلوم کی دعا سے متعلق ہیں۔

آخر میں اس طرح کہتے ہیں :۔

خیر کی امید رکھنی ہے عبث اس قوم سے　　　آپ کو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ
چارہ آخر کچھ نہیں حالیؔ بجز صبر و سکون　　　کر دعا اب "اِهْدِ قَوْمِي اِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"

۱۸۸۰ء

مسلمانوں کی ترقی پر مضمون :

قوم کے متعلق بالکل یہی نظریہ اسی سال وہ اپنے مضمون "کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں ؟" (تہذیب الاخلاق ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۰ء) میں بھی بیان کرتے ہیں :۔

"جو قوم ترقی کے بعد تنزّل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں، یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھُپ جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔"

اِسی مضمون میں حالی نے آگے چل کر بعض ایسے خیالات کے لوگوں کا جائزہ بھی لیا ہے جو اُس وقت یوں بھی کہتے تھے کہ :-

"مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لیے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں دُنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔"

مولانا حالی نے اس نظریے کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ دُنیا میں بھی کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس کے مذہب نے اس کی ترقی میں رکاوٹ پیش کی ہو۔ چنانچہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم عیسائی کی مذہبی تاریخ کے شواہد کو لے کے یہ بتایا ہے کہ :-

"جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے، اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔"

اس کے بعد مولانا حالی نے لوگوں کے اس قول کی تردید بھی کی ہے کہ :-

"ایک بار تنزّل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہو سکتی۔"

ان کے علاوہ اُس زمانے میں دو اور نظریے تھے - ایک یہ کہ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا، لہٰذا کوشش بے سُود ہے۔ دُوسرا نظریہ یُوں بھی تھا کہ جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں اُن کے برابر ایک ایسی قوم کی ترقی ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ مولانا حالی نے ان تمام خیالات کی تردید کی ہے اور تاریخی اور منطقی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ زوال یافتہ قومیں بھی ترقی کر سکتی ہیں لیکن مایوس نہ ہونا چاہیے۔ آخر میں انھوں نے اُمید دلائی ہے اور اس شعر پر مضمون ختم کیا ہے :- ؎

بجو اُمید کہ ایمانِ عشق کیشاں است　　کسے نہ داد تسلّی دلِ زلیخا را

مولانا دہلی کے اینگلو عربک ہائی اسکول میں مدرس تھے ہی- وہ اس سال یعنی ۱۸۸۰ء کے موسم گرما کی تعطیل میں یعنی ماہِ اگست در رمضان ۱۲۹۷ھ[1] میں ایک سفر کے لیے روانہ ہوئے اور علی گڑھ، فیروز آباد (ضلع آگرہ)، اٹاوہ، مین پوری، کانپور، ہمیر پور، الور وغیرہ کی سیر کی۔ علی گڑھ میں پانچ روز قیام کیا اور وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے تیسری بار دیکھے۔ بانیٔ مدرسہ کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے عوام کے عجیب و غریب خیالات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ :-

---

[1] غزل کا ایک شعر ہے :-

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی　　آپ اکثر رمضان ہی میں سفر کرتے ہیں

تہذیب الاخلاق اور قوم :

"یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ بانی مدرسۃ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرسۃ العلوم کی تعلیم میں کچھ دخل نہیں ہے ۔(۲) اس امر کا یہاں تک خیال رکھا جاتا ہے کہ رسالہ تہذیب الاخلاق جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپ کر شائع ہوتا ہے ۔ اس کی کاپی مفت یا بہ قیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی (۳) طلبائے مدرسہ کے افعال و اخلاق کی نگرانی پر یہاں وہ لوگ مامور ہیں جو جمہور اہلِ اسلام کے طریقے سے سرمو تجاوز کرنے کو بھی کفر جانتے تھے ۔(۴) علی گڑھ میں ہم ایسے دوستوں سے بھی ملے جو چند سال اس مدرسے کو دارالکفر سمجھتے تھے ۔ لیکن اب حد سے زیادہ اس کے مداح اور ثنا خواں ہیں ، اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں ۔ (۵) مدرسے میں دو چار کے سوا جو کہ مریض تھے ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ دار پایا ۔"

یہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن سے اس زمانے کے ان مسلمانوں کے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو سر سید کے تمام کاموں کے متعلق بدگمان تھے اور انھیں نہ صرف مدرسۃ العلوم سے بلکہ رسالہ تہذیب اخلاق سے بھی نفرت پیدا ہو گئی تھی ۔ کیونکہ اس وقت تک (۱۸۸۰ء تک) سر سید بہت سی ایسی کتابیں لکھ چکے تھے جن کی بنا پر قوم کو ان سے بدگمانی پیدا ہو چکی تھی ۔

مثلاً تحقیق لفظِ نصاریٰ۔ تبئین الکلام۔ احکام طعام با اہلِ کتاب تفسیر القرآن وغیرہ وغیرہ۔

نیرنگِ خیال پر رائے:

اسی سال محمد حسین آزاد کی کتاب "نیرنگِ خیال (حصہ اوّل)" شائع ہو گئی۔ اس پر حالی نے بسیط تقریظ لکھی جو ان کی "تنقیدات" میں شامل ہے۔ اس تقریظ کے شروع میں انھوں نے مغربی خیالات کو ضرور سراہا ہے اور فرسودہ مضامین سے پرہیز کرنے کے لیے نصیحت بھی کی ہے، لیکن ایک اور بات بڑے تپتے کی یہ کہی ہے کہ "میرے نزدیک جب تک ہمارے اہلِ وطن مغربی علوم اور مغربی لٹریچر اپنی دیسی زبان میں نہ سیکھیں گے، کبھی ان کے خیالات میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی"۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزی زبان کے الجھاؤ ایسے ہیں کہ طالب علم لغات اور محاورات کی تفتیش ہی میں مستغرق رہتا ہے اور کوئی ایسی تصنیف یا تالیف پیش نہیں کرتا جو اس کی عالی دماغی یا وسعتِ خیال پر گواہی دیتی ہو۔ چنانچہ مغربی خیالات کی جھلک تک نیرنگِ خیال سے قبل نظر نہیں آتی اور یہی ایک ایسی کتاب ہے جس سے علم انشا کی ترقی کا ایک نیا راستہ نکلا ہے۔

مولانا حالی نے اس کتاب کے صرف پہلے دو مضمونوں کا خلاصہ دیا ہے اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ :۔

"اسی اسلوب پر اور تمام مضامین لکھے ہیں جن کے دیکھنے اور غور

کرنے سے مغربی شاعرانہ خیالات کی بلندی اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد کتاب پر نکتہ چینی کی گنجائش ضرور ظاہر کی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ :-

"ایک ایسے ملک میں جہاں ترقی، ابتدائی حالت میں ہو، نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے جس میں زمانۂ حال کی عمدہ تصانیف پر اسی طرح نکتہ چینی کی جائے جیسے آج کل ارسطو اور بو علی (سینا) کی تصانیف پر کی جاتی ہے مگر یہ ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"

سنہ ۱۸۸۱ء

آبِ حیات پر تنقید :

اس طرح کہہ کر کہ مولانا حالی اس بحث سے آگے گذر گئے ہیں، لیکن کچھ عرصے کے بعد سنہ ۱۸۸۰ء میں جب محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات[1]" شائع ہوئی تو انھوں

---

[1] آزاد اس کتاب کے لیے سنہ ۱۸۶۵ء سے ڈول ڈال رہے تھے۔ ۱۰ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کے جلسے میں یہ تجویز انھوں نے پیش کی تھی کہ "ہر ہفتے میں شنبہ کے دن شام کے وقت مکان سکشا سبھا میں شائقین کا جلسہ ہوا کرے اور اس میں شعرائے سلف کا تذکرہ ہوا کرے۔" انھوں نے پہلے لیکچر میں زبان اردو کی تاریخ اور نشو و نما پر مضمون پڑھا (باقی حاشیہ بر صفحہ ۷۹)

نے ۱۸۸۱ء میں تبصرہ لکھا اور اس کتاب کے دونوں رخ دیکھے اور عملی نقادی کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا چنانچہ اس پہلی اچھی اور کامیاب کوشش کا اندازہ کرنے کے لیے چند اقتباسات ضروری معلوم ہوتے ہیں :-

"چند شخصوں کے سوا جن کے نشانِ قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پروائی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں، ہر شاعر کے سوانح عمری جہاں تک ممکن تھا نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے وقائع ایسے لکھے ہیں جن سے ان کی سیرت اور اخلاق پر استدلال ہو سکے۔ کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور جا بجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ تاریخ اردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔ پہلا مضمون جو زبانِ اردو سے متعلق ہے اُس نے انگریزی مورخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے اور پچھلا بڑا حصہ جو کہ اردو، بھاشا، عربی اور فارسی باتوں سے متعلق ہے وہ خاص کر مصنف کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں کوئی ضروری

(بقیہ حاشیہ ص ۷۸) دوسرے میں اصلیتِ زبانِ اردو، تیسرے میں نظم اور کلامِ موزون کے باب میں خیالات اور چوتھے میں شمس ولی اللہ موجد شاعری اُردو پر مضامین پڑھے۔ پھر شاہ حاتم، شاہ ہدایت اور ذوق وغیرہ پر لیکچر دیے۔ (اورینٹل میگزین۔ مئی ۱۹۳۴ء۔ ص ۵۶)

بات فرو گذاشت ہو گئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچۂ تہذیب الاخلاق کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس پرچے نے اردو زبان کو چند روز میں اس درجے تک پہنچا دیا ہے جو کم از کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ مذہب اخلاق، معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجے کے مضامین اس پرچے میں لکھے گئے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں مؤثر طریقے پر بیان کرنا اسی پرچے نے لوگوں کو سکھایا ہے۔ اردو نظم کی تاریخ میں نیچرل شاعری کا ذکر جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی، قلم انداز کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے اس باب میں مصنف کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیس اور مرزا دبیر کو خاتم شعرائے اردو لکھا ہے۔ بلکہ میر انیس کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بھی بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو میر انیس پر ہی ہو سکتا ہے۔ نظم اردو میں نیچرل شاعری کا پتہ اگر ملتا ہے تو میر انیس ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقے

ہیں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومن یا میر نظام الدین خاں ممنون۔ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فرو گذاشت نہیں کیا جائے گا۔

.... شعراء کے ذکر میں مصنف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ابتداء سے اخیر تک ہر ایک دور میں جو جو الفاظ متروک اور ان کی جگہ جو جو الفاظ مستعمل ہوتے گئے وہ بھی ذکر کیے جائیں۔ پھر جہاں جہاں معاصرین کو ایک دوسرے سے توارد ہوا ہے وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ہر ایک کا طرزِ بیان ایک ہی مطلب کے ادا کرنے میں کیسا تھا۔ ہر ایک شاعر کی سالم غزلیں لکھ دی ہیں تاکہ ناظرین اس کے عام خیالات کا اندازہ کر سکیں۔ ہر موقع پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے ایزاد کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس (مصنف) نے ابتدائے سنِ تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا، ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوں اور صرف افواہِ خلائق پر جاری ہوں کسی طرح ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔[۱] اکثر مقامات پر سلطنتِ مغلیہ کے

---

[۱] چونکہ سکشا سبھا میں ہر سینچر کو شعرائے سلف پر کچھ پڑھنا ہوتا تھا اسی لیے دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر فرضی باتیں بھی شامل کر لی ہوں گی۔ کیونکہ لیکچرار کے لیے یہ شرط ضروری تھی کہ "وہ مضمون علمی بعبارت دلچسپ اردو میں لکھے اور پڑھ کر انجمن میں سنایا کرے۔"

(اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۲۹ء۔ صفحہ ۵۵)

عبرت انگیز زوال کے) حالات پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے اور بے انتہا عبرت ہوتی ہے۔ اگرچہ مصنف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی کہ اردو شاعری نے ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق اور ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا۔ لیکن اس نے شعرا کا حال ایسا دلشگاف لکھا ہے کہ ہر صاحب رائے اس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔۔۔۔۔"

اس کے بعد مولانا حالی نے محمد حسین آزاد کی ایک اور فروگذاشت کی طرف بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے وہ اس طرح کہ آزاد نے شعرا کے باہمی رشک و حسد کے اسباب بیان نہیں کیے تھے ان کو حالی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور مذاق جمہور کی پستی پر بحث کی ہے جس کی وجہ سے میر کو بھی ایسی شاعری کرنی پڑی کہ "ان کا ایک شعر پڑھ کر بے اختیار منہ سے درد نکلتا ہے اور دوسرا شعر پڑھ کر نہایت شرم آتی ہے[1]"۔ اسی مذاقِ جمہور کے خلاف :

شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اوپر کے طویل اقتباسات محض اس لیے پیش کرنے پڑے کہ حالی کی سب سے طویل تنقید کا اندازہ ہو سکے۔ ان سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ انھوں نے کس

---

[1] جس زمانے میں آب حیات لکھی جا رہی تھی اور اس کے اجزا چھپنے شروع ہوئے تھے، محمد حسین آزاد نے غالب کے ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک، کے معنی حالی سے پوچھے تھے مکاتیب حالی (لاہور صفحہ ۱۷) آزاد کے نام ایک خط میں حالی نے غالب کی بعض اخیر زمانے کی غزلوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور ایک خط میں (صفحہ ۱۵-۱۶) قواعد کے بعض مسائل پر بحث کی ہے۔

غائر نظر سے کتاب کا مطالعہ کیا تھا، محاسن پر بھی نظر ڈالی تھی اور معائب کا جائزہ بھی لیا تھا۔ لیکن معائب کی طرف بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے اور اکثر و بیشتر ان کی اچھی توجیہ کر دی ہے جو حالی کے عالی ظرف اور شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔

۱۸۸۲ء

اس کے علاوہ ۱۸۸۱ء میں ان کی کوئی ادبی یادگار نہیں ملتی لیکن ۱۸۸۲ء میں انھوں نے بہت سی چیزیں لکھیں۔ اردو نثر و نظم کے علاوہ فارسی ادب سے بھی نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا بلکہ اس کا عمیق مطالعہ کیا۔ اردو میں ایک نظم "تعصب و انصاف" ۴۰ اشعار کی لکھی وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:-

نظم تعصب وا انصاف:

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا — جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا
اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی — اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی
اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے — اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے
اپنے انداز کے سودائی تھے — اپنے جلوے کے تماشائی تھے
کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ — سر دھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ
آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں — خود ہی ہم لیلیٰ تھے اور خود مجنوں

اس طرح قوم کی حالت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ ہم کو جو کچھ معلوم تھا

اُسی کو ہم سب[1] قوموں سے زیادہ سمجھتے تھے اور ہر نئی چیز کو مردُود قرار دیتے تھے۔ لیکن جوں ہی اس عصبیت اور جہالت کا احساس ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ (سرسید اور ان کے رفقا) جن کو ہم کافر اور انگریز پرست سمجھتے تھے وہی دراصل ہمارے محسن ہیں:۔

پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا حسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا
منہ جب آئینے میں دیکھا جاکر ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر
ہوا حیرت سے دگرگوں احوال ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال

٭

جس کے طعنوں کی تھی ہم پر بھرمار اُن کے ہم دل سے ہوئے شکر گزار
ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز چل رہے تیر ہیں جن کے دل دوز

٭

زہر نے ان کے جِلایا ہم کو ان کے طعنوں نے جگایا ہم کو

---

[1] سرسید نے یہی بات رسالۂ تہذیب الاخلاق میں (۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء) کے آخر میں لکھی تھی کہ "وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۷ھ (۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) جبکہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا، اُمید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جائے گا۔ ہماری قوم کی بد اقبالی جو کچھ تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سب کچھ ہیں"۔ حالؔی کی اس نظم "تعصب و انصاف" کے اکثر خیالات سرسیّد کے مضامین "تعصب" اور "مقاصدِ تہذیب الاخلاق" سے ماخوذ ہیں۔ سرسیّد نے موخرالذکر مضمون میں شاعری اور انشاپردازی کے ان عیوب کا ذکر کیا ہے جن پر حالؔی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

یارو اغیار کے عیب اور ہنر   آشکارا ہوئے ایک اک ہم پر

پھر بعض فقرا، علما، اغنیا، حکما اور قوم کے لوگوں کی ریاکاری اور خام کاری کا ذکر ہے اور ان اشعار پر اس نظم کو ختم کیا ہے :-

حالت الفقصۃ جو دیکھی اپنی   کوئی کل پائی نہ سیدھی اپنی
سارے آوے کو ٹٹولا جا کر   کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر
پایا اک دین کا محکم قانون   وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون
دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار   جی بھر آیا نہ رہا صبر و قرار
گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل!   آہیں دو چار گئیں دل سے نکل
تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا   حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا

مقدمۂ شعر و شاعری کے لیے ابتدائی کاوش :

حالیؔ کے یہاں سلاست اور روانی تو شروع ہی سے تھی، یہاں اس ہنر میں کمال پیدا ہو گیا ہے اور انھوں نے سہل ممتنع کی بے شمار مثالیں اپنے اشعار سے پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ نفس مضمون وہی ہے جس کے متعلق وہ ۱۸۷۱ء سے سوچ رہے تھے۔ اسی زمانے میں مقدمۂ شعر و شاعری والے مطالب کی ترتیب کا ارادہ بھی ہو رہا تھا۔ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "المزہر" جو اصول علم لغت کے متعلق ہے مولانا بڑے اشتیاق سے (کم از کم) "آٹھ دس روز کے لیے" دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں حافظ سعد اکبر عثمانی (بانی مدرسۂ اسلامیہ پانی پت۔ المتوفی سنہ ۱۳۰۱ھ) کو لکھتے ہیں (مکتوبات حالی، اول صفحہ ۱۸۱) کہ :-

"مجھ کو قاضی صاحب مرحوم کے کتب خانے میں سے ایک کتاب مطلوب ہے جس کا نام مُزہر ہے۔ مصر کی چھپی ہوئی ہے اور اصولِ علمِ لغت میں جلال الدین سیوطی نے لکھی ہے۔ اس کی ضخامت شرح وقایہ سے کچھ زیادہ ہو گی۔ مجھ کو اس کی نہایت ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے گھر میں جتنی کتابیں موجود ہیں وہ سب نواب (افضل احمد خاں) صاحب اس کی ضمانت اور کفالت میں لے لیویں اور آٹھ دس روز کے واسطے وہ کتاب دے دیں۔ میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہو گئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے، اس نیاز نامے کا جواب جلدی مرحمت ہو۔" زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین، از دہلی۔ ۹ جنوری ۱۸۸۲ء

لیکن جیسا کہ بعد میں ذکر کیا جائے گا، سیوطی کی المزہر سے حالی کو خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا اور وہ اس کے ماخوذ کتاب العُمدہ کی طرف رجوع ہوئے تاہم اردو شاعری کی ان خرابیوں کے متعلق وہ مسدس (۱۸۷۹ء) میں اور آبِ حیات (۱۸۸۰ء) کے تبصرے کے سلسلے میں بھی بحث کر چکے تھے یعنی ۱۸۷۹ء تک ان کے

رجحانات ترتیب پا چکے تھے اور اس سے بہت پہلے لاہور کے قیام میں ہماری شاعری کی وقعت ان کے دل سے کم ہونے لگی تھی۔ قوم اور وطن کے فائدے کے لیے حالی نے اپنی ہر چیز وقف کر دی تھی اور یہی جذبہ ان کے ہر کام میں کار فرما تھا۔ اس سال کی نظم "تعصب اور انصاف" میں بھی یہ جذبہ بہت زیادہ نمایاں تھا جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال مقدمے کی ترتیب کا خیال مولانا حالی کے ذہن میں اس سال سے شروع ہوا گو کہ اس پر انھوں نے دس سال کے بعد ۱۸۹۳ء میں قلم اٹھایا۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اصطلاحات کس زبان سے اخذ کی جائیں:

اسی سال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک تنقید "منطق استقرائی" پر لکھی تھی جو مولوی محمد حسین ایم۔ اے کی تالیف تھی یہ ضلع رہتک کے رہنے والے تھے اور اہلِ پنجاب میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ایم اے پاس کیا تھا۔ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور ریاضی پڑھاتے تھے اور "اخبار انجمن پنجاب" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انھوں نے منطق قیاسی کے خلاف منطق استقرائی پر بیکن کی "نووم آرگینم" کی طرح بحث کی ہے اور اردو زبان میں بالکل نئی چیز پیش کی ہے۔ یہ دراصل کسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ تھا لیکن محض لفظی ترجمے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ مولانا حالی نے اعتراف کیا ہے کہ "علمی مسائل کا بیان اس سے زیادہ سہل اور آسان ہونا نہایت دشوار ہے۔" اصطلاحات کے وضع کرنے کے سلسلے میں مولانا ایک اہم

نکتے کا ذکر کرتے ہیں کہ "مشرقی زبانوں میں صرف دو زبانیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے غرض پوری ہو سکتی ہے۔ ایک سنسکرت اور دوسری عربی لیکن سنسکرت کا جاری ہونا عرب، شام، ایران، ترکستان اور افغانستان وغیرہ میں قریب محال کے ہے اور نیز علومِ جدیدہ کی نئی اصطلاحیں بالفعل سنسکرت میں موجود نہیں البتہ عربی زبان ایسی ہے جس کی اصطلاحیں ایشیا کے اکثر حصّوں میں جاری ہو سکتی ہیں اور نیز علومِ جدیدہ کی بے شمار اصطلاحیں عربی میں وضع ہو چکی ہیں۔"
اس کے علاوہ کوئی اور خاص چیز اس تنقید میں نہیں ملتی۔

سفرنامۂ ناصر خسرو کا دیباچہ:

اسی سال مولانا حالی نے "سفرنامۂ حکیم ناصر خسرو" پر دیباچہ اور حکیم کے سوانح بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی زبان میں لکھے۔ یہ مضمون بہت طویل ہے اور بڑی محنت سے تیار کیا ہے اور اس وقت تک جتنے مشہور تذکرے یا کتابیں اس موضوع پر مل سکتے تھے ان سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً تاریخ گزیدہ، مجمع الفصحاء، روضۃ الصفا، حبیب السیر، دبستان المذاہب، تذکرۂ دولت شاہ، آثار البلاد، آتش کدہ، مظہر العجائب، مفتاح التواریخ، تقویم التواریخ وغیرہ۔ ان کے علاوہ فرانسیسی فاضل چارلس شیفر کے مضمون سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے مولانا حالی نے آج سے ستر سال قبل جو کچھ لکھا تھا وہ بہت غنیمت ہے، کیونکہ اس زمانے میں اتنی کتابیں اور ماخذ جو اب دستیاب ہیں موجود نہ تھے اور انھیں صرف

سفرنامہ ہی پر اکتفا کرنا پڑا تھا اور بجز اس کے ناصر خسرو کی کوئی اور تصنیف نہ مل سکی تھی [۱]۔

سنہ ۱۸۸۳ء

مثنوی کلمۃ الحق:

پھر ۱۸۸۳ء میں کئی چیزیں یادگار ملتی ہیں۔ مثنوی کلمۃ الحق [۲]، راست گوئی کے متعلق لکھی ہے۔ اس میں ایک سو بیس اشعار ہیں۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:-

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو | اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی | حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
ہے ناگواری پہچان تیری | اَلْحَقُّ مُرٌّ ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے | چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
رشتے ہزاروں تو نے تڑائے | باپوں سے بیٹے تو نے چھڑائے

یہ مثنوی اسی طرز کی ہے جس کی بنا ۱۸۷۴ء میں پڑ چکی تھی۔ اس میں پہلے

---

[۱] مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری نے اس سفرنامہ کا اردو ترجمہ مع مفید حواشی اور محققانہ سوانح کے، انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۱۹۴۱ء میں شائع کرایا ہے۔ اور مولانا حالی نے اصل سفرنامہ مع حالات دمطبع اخبار "خیر خواہ" دہلی ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں شائع کرایا تھا۔

[۲] سرسید نے ۱۸۴۹ء میں اسی نام کی ایک کتاب پیری مریدی کے مروجہ طریقے کے خلاف لکھی تھی۔

مختلف واقعات کے متعلق اشارات ہیں کہ سچ بولنے والوں پر کیا کیا مصیبتیں آئیں۔
پھر اس کے محاسن بیان کیے ہیں اور بڑے لطیف انداز میں فرماتے ہیں :-

اے راست گوئی تجھ سے وہ افسوں | منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی میں تیری طرفہ مزا ہے | ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے
تو نے جہاں دی آواز جا کر | لاکھوں سر اُٹھے تیری صدا پر
ہوتی ہے دھیمی آواز تیری | بڑھتی ہے کم کم آواز تیری
پھر دوڑتی ہے یوں مردوں میں | جس طرح آتش لگتی ہے بن میں
بنتے ہیں دشمن، انصار تیرے | چھٹتے ہیں قیدی، احرار تیرے

آخر میں حالی نے "راست گوئی" کے ساتھ راست گوئی کا حق ادا کر دیا ہے
لکھتے ہیں :-

اے کلمۂ حق! اے سرّ یزداں | جس وقت ہو تو پردے سے عریاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے | دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے
عالم ہو تیرا جب ناشناسا | حالی کو رکھیو اپنا شناسا

مناظرۂ واعظ و شاعر :

اس کے بعد ہی "مناظرۂ واعظ و شاعر" ہے جو اسی سال (۱۸۸۳ء) میں لکھا گیا۔
اس کی ابتدا بالکل ذوق کے اس قصیدے کی طرح ہے جو اس انداز سے شروع
ہوتا ہے :-

شب کو میں اپنے سر بستر خوابِ راحت | نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

اور حالی نے اس طرح شروع کیا ہے :-

کل جو میں نے بسترِ راحت پہ جا کے دم لیا
دل کو اک وقفہ غمِ دنیا سے فرصت کا ملا

کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار
مجلسِ اربابِ معنی جس کو کہنا ہے بجا

گرم تھا واں ہر طرف ہنگامۂ بحث و نظر
سرخ رو گلگونۂ حجت سے تھا ہر مدعا

یہ مناظرہ شعرائے فارسی کے انداز میں ہے۔ مولوی، فلسفی، صوفی اور واعظ کی ایک خیالی محفل سجائی گئی ہے جہاں شاعر بھی ہے اور وہ اپنی تعلی کر رہا ہے۔ یہاں مولانا حالی نے بالواسطہ شاعر اور واعظ کی زبان سے وہ تمام عیوبِ شاعری بیان کر دیے ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے بعد میں مقدمۂ شعر و شاعری کی تعمیر کھڑی کی تھی اور یہ "مناظرہ" اسی وجہ سے بہت اہم ہے۔ واعظ کے عیوب جو شاعر کی زبانی بیان کیے گئے ہیں وہ خصوصاً اسی زمانے کی غمازی کرتے ہیں جبکہ یہ "مناظرہ" لکھا گیا تھا۔ شاعر اور واعظ جہاں ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں، اس موقع کے چند اشعار شاعر کی زبان سے سنیے :-

اپنے اپنے کام اور پیشے میں ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں، ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا

وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا

مدح میں ہم بھی یوں ہی کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تنِ ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا

اس کے بعد مولانا حالی نے ہارتے ہوئے واعظ کی نفسیات کا بہت دلچسپ

چربہ اتارا ہے اور اپنے شاعرانہ کمال کی داد دی ہے:۔

چبھتی اور دکھتی، سخن ور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا

دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا

پر بظاہر داغ یہ تو امن سے دھونے کے لیے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا

ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ ذکر اور
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے بُرا

کہیے فکرِ شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق؟
آپ نے دیواں مرتب کیوں نہیں اب تک کیا

ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجیے انصاف اگر
ہے غزل میں آپ کی دیوانِ حافظ کا مزا

عرض کی شاعر نے حضرت کا ہے یہ سب حسنِ ظن
ورنہ میں کیا اور مرا مجموعۂ اشعار کیا

قبلہ اب وہ دن گئے جب شاعروں کی قدر تھی
شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا

شعر اگر کہیے تو روٹی جا کے کس سے کھائیے
سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگدست و بے نوا

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی اُستاد کا

اس گئے گذرے زمانے میں بھی یہ فنِ شریف
کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا ہے، کیمیا

آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال
پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ دکھ اب آئے گا

روز اک سونے کی چڑیا گر نہ ہاتھ آئی نہ آئے
ہم گنہ گاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے پھر بڑا

منتہی العروض پر تبصرہ :

اسی سال مولانا کا ایک تبصرہ مولوی سید محمد کے اردو رسالہ منتہی العروض کے متعلق اسی رسالے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس میں فنِ عروض کے متعلق پہلے نثر میں بحث ہے اور وہ "بوجہ استیفا" اور "منضبط کے ساتھ" ہے پھر مثنوی میں بھی عروضی مباحث آسان طریقے پر بیان کیے ہیں اور طلبہ کے لیے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ یہ چند سطروں کی "تقریظ" اپنی نکھری ہوئی شکل میں ہے اور لفاظی کی چمن بندی سے بالکل پاک ہے اور یہی اس تقریظ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

مسئلہِ حجابِ زنان :

اسی سال یعنی سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں مولانا حالی نے ایک مضمون

"مسئلۂ حجابِ زناں" اپنے وطن پانی پت کے شرفاء کے لیے لکھا تھا۔ لیکن اس وقت شائع نہیں ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے بے پردگی کو معیوب قرار دیا ہے۔ قلعۂ دہلی کے اندر اسی بے پردگی کو مختلف اندرونی خرابیوں کا موجب کہا ہے۔ قصبات کو شہروں سے بہتر قرار دیا ہے کیونکہ وہ مذموم اور قبیح باتیں جو شہروں میں پائی جاتی ہیں وہ وہاں نہیں ہوتیں۔ اسی لیے مولانا نے پانی پت کو چھوڑ کر دہلی کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ حالانکہ "میں کچھ اوپر تیس برس سے شہر دہلی میں آمد و رفت رکھتا ہوں اور کم سے کم پندرہ سولہ برس اس شہر میں میرا قیام رہا ہے"۔[۱] دینی اور عقلی دلائل کے بعد مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں کہ:

"پردے کے محکم اور مضبوط قاعدے کو ہاتھ سے نہ چھوڑو کہ اس اخیر زمانے میں صرف یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی بدولت ہم تمام دنیا کی قوموں پر فخر کر سکتے ہیں اور صرف یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے قوم میں غیرت اور حمیت باقی رہ سکتی ہے"۔

اس مضمون سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا حالی، انگریزوں کی ہر چیز کو قبول نہیں کر لیتے تھے بلکہ ان کا عمل اس پر تھا کہ: "خذ ما صفا ودع ما کدر"۔

۱۸۸۴ء

مناجاتِ بیوہ:

اس کے بعد غالباً ۱۸۸۴ء میں "مناجاتِ بیوہ" لکھی گئی جو اپنی نوعیت کی

---

[۱] مقالاتِ حالی حصہ اول، مضمون نمبر ۳۱۔ کچھ اوپر تیس سال سے شہر دہلی میں آمد و رفت تھی۔ یعنی دہلی ۱۸۵۲ء جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں ہے۔ (حاشیہ نمبر ۱، ص ۹۳)

لاجواب نظم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کم از کم اردو شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حالیؔ نے بیوہ کے دکھ درد کو اسی کی زبان سے ایسے پُر درد انداز میں بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جاتا ہے۔ اس نظم کی سلاست، روانی، سوز و گداز اور درد و اثر، اپنی نوعیت میں یکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی سے متعلق جو مسلّمہ نظریہ ہے۔ دیکھیے کس انداز میں پیش کیا ہے:-

ریت کی سی دیوار ہے دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
بجلی کی سی چمک ہے اس کی — پل دو پل کی جھمک ہے اس کی
پانی کا سا ہے یہ پچارا — جگنو کا سا ہے چمکارا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے

ان اشعار کو آسانی کے ساتھ ہندی رسم الخط میں شائع کیا جا سکتا ہے اور خالص ہندی بھی کہا جا سکتا ہے۔ گویا حالیؔ کی یہ پہلی کوشش ہے کہ ملک کی مشترکہ زبان کس انداز سے لکھی جا سکتی ہے۔ اور دیکھیے:-

ملک کی مشترکہ زبان کا نمونہ:

شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری

---

(۱) بقیہ صفحہ ۹۲) اس نظم کا صحیح سال تصنیف نہیں مل سکا۔ کراچی کے کتب خانے اپنی بے بضاعتی کے لیے مشہور ہیں۔ حامد حسن قادری نے ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی (صفحہ ۹۹) میں ۱۸۸۴ء یا ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔

سیلانی جب باغ میں آئے — پھول ابھی تھے، کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم — جب ہوئی پیت گنوایا پیتم
نیند سے کر بچپن کا ہے رنڈاپا — دُکھ پڑنا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچائی — کاٹنی ہے بھرپور جوانی
شام کے مردے کا ہے رونا — ساری رات نہیں ہے سونا

◆

تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھُو کی — سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں

اس نظم کی تعریف اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ "اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔"[1]

بھائی کا مرثیہ:

اس کے بعد ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء۔۱۸۸۶ء) کا لکھا ہوا ایک مرثیہ ملتا ہے جو قطعے کی شکل میں ہے اور ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین منظر کی وفات پر ہے۔ اس قطعے میں کل بیس شعر ہیں، لیکن وہ اپنی سلاست اور روانی

۱؎ بحوالہ رسکینا۔ اس نظم کے سلسلے کی دوسری نظم "چپ کی داد" ہے۔

کے علاوہ قلبی واردات کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ یادگار قرار پائیں گے۔

اس قطعے کی ابتدا بھی نئے انداز سے کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھ کے چپ چاپ
حالؔی سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی
خاموش کبھی ہم نے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی

☆

ہنستا ہے، نہ روتا ہے، نہ بذلہ ہے، نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

☆

اک آہ بھری سُن کے یہ حالؔی نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے جو منجدھار کے نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاضی و دانی
حالؔی ہی کو معلوم ہے حالؔی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالؔی کا سا بھائی
غم بھائی کا، مر جانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ سے پانی

جس بھائی کے آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کی گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اُس کو اٹھانی

دِل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو!
کیا ڈھونڈھتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

حقیقت یہ ہے کہ ایسے بڑے بھائی[1] کا غم ایسا ہی ہوتا ہے اور اس روح فرسا قلق سے اسی طرح زبان بند ہو جاتی ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی کے اس پُر درد اور سادے مرثیے پر بہت سے پُر شکوہ رسمیہ مرثیے قربان کیے جا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی اپنے بڑے بھائی کی علالت پھر وفات کی وجہ سے عرصے تک آزردہ خاطر رہے۔ کیونکہ ۱۲۹۵ھ میں ان کا کوئی

---

[1] دیوانِ حالی کے آخر میں حالی کے بڑے بھائی کے لکھے ہوئے چند قطعات تاریخ بھی درج ہیں۔ ایک تاریخ خود ان کی وفات کے متعلق بھی ہے جو اُن کے صاحبزادے حافظ اخلاق حسین نے نکالی تھی۔ لیکن منظر کی وفات کی صحیح تاریخ اس میں بھی نہیں ہے۔ شاید قبر کے کتبے میں ہو گی جو دہلی میں خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ہے۔

اور علمی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ ۱۳۰۳ھ میں ان کے بڑے بھائی صاحب کا انتقال ہوا۔ لیکن چونکہ صحیح تاریخِ وفات کا علم نہیں ہے اور یہ ہجری سال ماہِ اکتوبر ۱۸۸۵ء سے شروع ہو کر ستمبر ۱۸۸۶ء میں ختم ہوتا ہے۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ مولانا حالیؔ نے ۱۸۸۵ء میں بھی کچھ نہیں لکھا۔

۱۸۸۶ء

حیاتِ سعدیؒ:

۱۸۸۶ء کے اوائل میں (جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے) سیرت نگاری پر مولانا حالی کی سب سے پہلی کتاب حیاتِ سعدی شائع ہوئی، لیکن اس کے سالِ تصنیف کے متعلق بہت اختلاف ہے[۱]۔ حیاتِ سعدی کے دیباچے میں مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم نے سب سے اول شیخ (سعدی) کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے

---

[۱] "ترجمۂ حالی" میں مولانا نے اس کتاب کا سالِ تصنیف نہیں دیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے رسالہ جامعہ (دہلی) اکتوبر ۱۹۳۵ء (صفحہ ۹۰۷) میں ۱۸۸۱ء لکھا ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخِ اردو کے صفحہ نمبر ۵۸۶ میں ۱۸۸۲ء اور صفحہ ۵۹۰ میں ۱۸۸۴ء لکھا ہے۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی صفحہ ۱۱۱ میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب غالباً مولانا نے ۱۸۸۴ء میں شائع کی تھی"۔

رتبے کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمری اور ان کی تصنیفات کا بیان جُدا جُدا لکھیں گے۔"

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ سوانح نگاری میں مولانا حالیؔ نے سب سے پہلے سعدیؔ ہی کو پسند کیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سعدی جیسے اکابر کے کارنامے پیش کر کے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کریں دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

"جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے بیوگرفی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔"

اسی دیباچے میں حالیؔ نے بایوگرافی کی ابتدا، ارتقا، اور اس کے مقاصد و شرائط کا اجمالاً ذکر بھی کیا ہے۔ اور کتاب کے "خاتمے" میں اچھے اور اثرانگیز شعر کے لئے چند شرائط بھی بیان کی ہیں:۔

"شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقتِ واقعیہ پر نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔

دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت، نرالاپن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔

تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کئے جائیں کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو، اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔

چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہئے ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا۔

یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔"

شاعری سے متعلق حالی کے یہ خیالات اس لئے اہم ہیں کہ انہی کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ بعد میں مقدمۂ شعر و شاعری کے پہلے حصے میں بیان کیا ہے اور انہی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یادگارِ غالب میں غالب کی شاعری پر بحث کی ہے۔

حیاتِ سعدی کو مولانا حالی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ شیخ سعدی کی سوانح حیات کے متعلق ہے اور اس

کے لیے انھوں نے مشہور کتابوں میں سے نفحات الانس، جواہر الاسرار، تاریخ جہاں کشا، تاریخ وصاف، مجالس المومنین، تذکرہ سودا، تذکرۂ قاسم، علی بن احمد جامع، کلیاتِ سعدی کا دیباچہ، سر گور اوسلی کا تذکرہ اور عام تذکروں وغیرہ سے استفادہ کیا ہے اور زیادہ تر کلیات کی داخلی شہادت کو قاعدے کے مطابق ترجیح دی ہے۔ دوسرے حصے میں کلام پر تبصرہ ہے اس میں گلستاں اور بوستاں کے ترجموں وغیرہ کا جہاں ذکر ہے وہاں کلارک بوستاں والے انگریزی ترجمے کا ذکر بھی ہے جو ۱۸۷۹ء میں ہوا تھا۔

اسی کے آگے مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارے دوست پنڈت مہرچند داس مہاجن اگروال جینی مذہب متوطن قصبہ سونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستاں کا ترجمہ نظم کا نظم اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش کے ساتھ کیا ہے جو ۱۸۸۸ء میں چھپ کر شائع ہوگیا۔"

اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ حیاتِ سعدی ۱۸۸۶ء کے بعد شائع ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کا اضافہ حیاتِ سعدی کے

دوسرے ایڈیشن[1] میں ہوا ہے اور یہ کتاب پہلی بار ۱۸۸۶ء کے اوائل میں ضرور شائع ہو چکی تھی۔ کیونکہ مولانا شبلی نے ۱۰ مارچ ۱۸۸۶ء کے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ابھی "حال میں" آئی ہے اور وہ "نہایت دلچسپ محققانہ" اور "بے مثل" ہے۔ وہ خط مولوی محمد سمیع صاحب کے نام ہے اور اس طرح ہے:۔

"عزیزمن! ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے۔ یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ دیکھو، کہیں واپس نہ جائے قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ باقی خیریت، اس کتاب کے اور بھی خریدار پیدا کرنے چاہییں۔"

والسلام۔ شبلی نعمانی۔ ۱۰ مارچ ۱۸۸۶ء[2]

حیاتِ سعدی کو مولانا شبلی دل سے پسند کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۱ء میں مدیرِ "زمانہ" (کانپور) کو ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اردو میں حیاتِ سعدی، آبِ حیات، بعض تصانیف سرسید، توبۃ النصوح، دیوانِ غالب، دیوانِ میر کو میں دل سے پسند کرتا ہوں۔"[3]

---

[1] مکاتیبِ حالی (سنہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۵) میں حیاتِ سعدی کی ترمیم کا ذکر ہے

[2] مکاتیبِ شبلی حصہ اول صفحہ ۷۵

[3] مکاتیبِ شبلی حصہ دوم صفحہ ۲۳۵ لیکن مولانا عبدالحق صاحب نے "چند ہم عصر" میں حالی

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۰)

بہرحال حیاتِ سعدی اردو سیرت نگاری میں سب سے پہلی کامیاب کتاب ہے اور اسی کے انداز پر خود مولانا حالی کی اور مولانا شبلی وغیرہ کی سیرت والی کتابیں تیار ہوئیں۔ یعنی کتاب کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ پہلے حصّے میں محققانہ سوانح اور دوسرے حصّے میں "ہیرو" کی خدمات پر بحث ہوتی ہے۔ واقعۂ ہجرت سے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے چھ اشعار کا منظوم ترجمہ مولانا حالی نے خلیفہ سید محمد حسین (میر منشی ریاست پٹیالہ) کی فرمائش پر ۳۰ نومبر ۱۸۸۶ء کو لاہور میں کیا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں۔[1]

۱۸۸۷ء

مسدس "ننگِ خدمت"

۱۸۸۷ء میں بھی حالی کی مصروفیات بڑھی ہوئی تھیں۔ مسدس موسوم بہ "ننگِ خدمت" اسی سال لکھا تھا۔ اس میں ۵۵ بند ہیں اور قوم کی غفلت کا مرثیہ ہے کہ:۔

حق نے شائستۂ ہر باب بنایا تھا ہمیں   ایک ہی دام میں پھنسانا سکھایا تھا ہمیں

(بقیہ حاشیہ صہ ۹۹) کے ذکر میں لکھا ہے کہ محمد حسین آزاد کی طرح مولانا شبلی نے مولانا حالی کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ مولانا شبلی نے مذکورۂ بالا تحسینی کلمات کے علاوہ حیاتِ سعدی کے متعلق شعرالعجم حصّۂ دوم میں سعدی کے ذیل میں لکھا ہے کہ:۔

"مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔"

یہ شبلی کا انکسار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حالی سے زیادہ بہتر سعدی کے متعلق لکھا ہے۔

---

[1] رسالہ "نقوش" (لاہور۔ جنوری ۱۹۶۳ء) پیش کردہ جناب محمد اسماعیل پانی پتی

رستہ ہر کوچہ و منزل کا بتایا تھا ہمیں زینہ ہر بام پہ چڑھنے کا دکھایا تھا ہمیں
ایسا کچھ بادۂ غفلت نے کیا متوالا
طوقِ خدمت کا لیا اور گلے میں ڈالا

ورثِ مخلوق کو ہم علیٰ دوا مادی سمجھے طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغا سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوا سمجھے ننگِ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے
عیب گننے لگے نجاری و حدادی کو
بیچتے پھرنے لگے جوہرِ آزادی کو

یہ دو بند پورے مسدس کا خلاصہ ہیں۔ بقیہ بند مختلف تشریحات سے متعلق سمجھنے چاہئیں۔ تجارت کی خوبیوں اور نوکری کی برائیوں کو جس طرح سمجھایا گیا ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں شاذ و نادر ہیں۔ آخر میں حالی نے عجز و انکسار سے اپنے کلام کو "بے اثر" کہہ کر بڑا اثر پیدا کر دیا ہے :۔

ہو گئے حالیؔ سے زندہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا خود ہیں گمراہ مگر قوم کے ہیں راہ نما
جھکتے جھکتے ہوئی پشت آپ کی خدمت میں دوتا اس پہ ہے خبط کہ آزادہ روی کا دعویٰ
بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں اثر
ورنہ بے صرفہ نصیحت سے خموشی بہتر

انجمنِ اسلامیہ کی جوبلی :

اسی سال مولانا حالی، دہلی کے اینگلو عربک اسکول سے بدلی کرا کے[1] اسلامیہ کالج لاہور

---

[1] مکتوبات حالی حصہ اول کے صفحہ ۱۲۱ میں جو خط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جنوری
(باقی بر صفحہ آئندہ)

کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے لیکن وہاں آٹھ مہینے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ جون ۱۸۸۷ء میں اپنی جگہ واپس آگئے۔ لاہور کے قیام میں اس سال یعنی ۱۸۸۷ء میں انجمن اسلامیہ لاہور کے جشن جوبلی کے موقع پر ۲۵ شعر کا ایک قصیدہ لکھا تھا جو انجمن کے ایڈریس کے ساتھ انجمن کی طرف سے ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

ہے عید یہ کس جشن کی یارب کہ سراسر ‏ ‏ ہے جوبلی ہی جوبلی ایک اک کی زباں پر
یہ عہد کہ گذرے ہیں برس جس کو پچاس اب ‏ ‏ ست جگ سے ہے ہندستاں کے حق میں کہیں بہتر
وہ دورِ تعصب تھا، یہ ہے دورۂ انصاف ‏ ‏ وہ جنگ کا مُوجد تھا، یہ ہے صلح کا رہبر
جمشید پہ جب آگ ہوئی سنگ سے ظاہر ‏ ‏ ایراں میں کیا جشنِ سدہ اس نے مقرر
اس عہدِ ہمایوں میں ہزار ایسے کرشمے ‏ ‏ ظاہر ہوئے اس طرح کہ عقلیں ہوئیں ششدر
یہ جشن مبارک ہے بہت جشنِ سدہ سے ‏ ‏ وہ آگ نکلنے کا، یہ بجھنے کا ہے منظر

اِس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے
تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر

حالیؔ نے انگریزوں سے پہلے کے عہد کو "دورِ تعصب" کہا ہے۔ جہاں دوسری برائیوں کے علاوہ "مُنہ زوری و خونریزی" "سستی" اور "ٹھگی" وغیرہ بھی تھی۔ پھر وکٹوریہ کے عہد کی تعریف ہے۔ اور دعائیہ پر قصیدہ ختم ہو جاتا ہے۔ قصیدے میں خوشامد ضرور

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۱۸۸۶ء میں لاہور گئے اور چیفس (ایچیسن) کالج میں رہے۔ حصہ دوم میں مارچ ۱۸۸۷ء والا خط بھی اسی ایچیسن کالج کا ہے (صفحہ ۹۵) اور وہاں وہ جون ۱۸۸۷ء کے پہلے ہفتے تک رہے (صفحہ ۱۰۱) پیچش اور ڈاڑھ کا درد بھی وہاں ہو گیا تھا۔ (ص ۹۰)

اور قوم کی خاطر سرسیّد کی طرح حالی بھی عرصے تک حکمتِ عملی سے کام لیتے رہے۔ تاہم فن کے لحاظ سے یہ قصیدہ بھی سلاست کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ:

غالباً اسی سال "پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ" ایک نظم لکھی جس میں ۸۰ اشعار ہیں۔ یہ اسی رنگ میں ہے جس میں "مناظرہ رحم و انصاف" نظم لکھی تھی۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:-

پھوٹ سے ایکے نے یہ کی گفتگو — میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو
میرا ہے یا تیرا مبارک قدم — مجھ سے ہے یا تجھ سے بقائے امم
اپنی ستائش نہیں زیبا مگر — حق نہ جتاؤں تو ہے خوفِ ضرر

اس نظم میں حالی کی ذہانت قابلِ داد ہے۔ انھوں نے پھوٹ جیسی برائی میں سے ایسی ایسی خوبیاں ڈھونڈ نکالی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ چند شعر سنیے۔ پھوٹ اس طرح گویا ہے:-

نام ہے بدنام مقرر مرا — ذکر برائی سے ہے گھر گھر مرا
پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر — میں ہوں وہی جو کہ ہے تو سر بسر

+

اپنوں سے تو غیروں کو کرتا ہے زیر — میں ہوں کہ دل غیروں کا رکھتی ہوں سیر
میں کروں تائید نہ تیری اگر — ہو کوئی خوبی نہ تری جلوہ گر

+

(دیکھیے حاشیہ بر ص ۱۰۴)

یں جو نہ ایران کو ولاتی شکست   رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست

پھر انگریز قوم کے آنے سے جو برکت ہندوستان کو حاصل ہوئی اس کا ذکر ہے وہ خوشامد ضرور ہے لیکن حقیقت بھی ہے :۔

ہند میں کرتی نہ اگر یں وطن   پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم و فن

جب نہیں غفلت کا اُترتا خمار   ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار

کرتے سزا سے نہیں پھر درگذر   کارگذارانِ قضا و قدر

ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور واں   تا کہ کروں قدرتِ باری عیاں

اس طرح مناظرہ ہوتا رہتا ہے اور آگے چل کر پھوٹ کو شکست ہوتی ہے۔

آخر میں بارگاہِ خداوندی میں دُعا ہے کہ :۔

پھُوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب   ایک سے ایک ان میں بچھڑ جائے جب

رکھنی ہے باقی تجھے گر ان کی نسل   تفرقہ کر اُن کا مبدل بہ وصل

ورنہ اگر ہو نہ ملاپ ان کو راس   اور نہ ہو سر جوڑنے کی ان کو آس

وہ جیے تو کیا جیے بے آبرو   جلد اٹھا لے انھیں دنیا سے تو

(حاشیہ صفحہ ۱۰۴) سلہ حالیؔ کے اس شعر کے ساتھ غزل کا ایک شعر یہ بھی پڑھیے :۔

کمال ہے ضدِ بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرد
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا، تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

حق یہی ہے اس قوم کے بہتر فنا ‏ ‏ ‏ ‏ پھوٹ ہے جس قوم میں وہ قوم کیا

ان اشعار سے نہ صرف مولانا حالی کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس زمانے کی قوم کے حالات کا پتہ چلتا ہے جن کی بنا پر حالیؔ کے دل سے یہ آواز اُٹھی۔ غزل کا ایک شعر اسی رنگ میں ہے :۔

قوم کو حالیؔ نہیں راس اتفاق ‏ ‏ ‏ ‏ پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

فرہنگ آصفیہ کی تعریف :

۱۸۸۸ء میں لکھی ہوئی ایک تنقید بھی ملتی ہے جو مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے متعلق ہے اور جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی۔ اس تنقید یا تقریظ میں فرہنگ کو صحیح معنوں میں سراہا ہے اور مولف کی سالہا سال کی محنت کی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اردو لغت لکھنے والوں کے لیے دو شرطیں ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ اس کا لکھنے والا کسی ایسے شہر کا باشندہ ہو جہاں کی زبان تمام ہندوستان میں مستند سمجھی جاتی ہو اور دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو۔ "کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں کی بنیاد رکھی جائے گی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں یہ دونوں شرطیں موجود ہیں" فرہنگ آصفیہ کی بعض خامیوں کے متعلق صرف اشارہ کر دیا ہے کہ :۔

"اگرچہ ممکن ہے کہ اردو ڈکشنری میں کچھ باتیں گرفت کے قابل نکلیں لیکن ایسی باتوں سے اوچھے نکتہ چینیوں کی طرح تمام

کتاب کو موردِ طعن ٹھہرانا یا مصنف کا احسان نہ ماننا سخت بے انصافی ہو گی ۔۔۔ اکثر اوقات صرف ایک لفظ کی تحقیق میں لوگوں سے کئی کئی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، پس ممکن نہیں کہ جو شخص ایک مستقل اور وسیع زبان کے تمام الفاظ کی تحقیق کرے وہ لغزش اور خطا سے محفوظ رہ سکے ۔"

آخر میں پھر قدر دانی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ :۔

"ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس اردو ڈکشنری کی ایسی ہی قدر کریں گے جیسی کہ حق شناسوں کو اپنے محسن کے احسان کی قدر کرنی چاہیے ۔"

سنہ ۱۸۸۸ء

گلستان (ناگری) پر تبصرہ :

اسی طرح کی قدر دانی اس کے دوسرے سال یعنی ۱۸۸۸ء میں بھی موجود ہے جبکہ حالی نے پنڈت مہر چند داس کی گلستان ناگری پر تبصرہ کیا تھا۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ تبصرہ بھی شائع ہوا تھا۔ پنڈت جی نے اس کتاب میں دو کالم بنائے تھے۔ ایک میں اصل گلستان (فارسی تھی اور دوسرے کالم میں اس کا ہندی ترجمہ تھا۔ "لائق مترجم نے اس ترجمے میں یہ التزام کیا ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا ترجمہ نظم میں لکھا جائے اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال میں نہ لائے جائیں اور جہاں تک ہو سکے ترجمے میں اصل کتاب کے الفاظ کی پابندی کی جائے اور شیخ کا اسلوبِ بیان تابمقدور اپنی حالت پر قائم رہے ۔" اس قدر دانی کے

علاوہ کوئی اور بات اس "پیش لفظ" میں نہیں ہے۔

حیدر آباد کا وظیفہ:

اب تک مولانا حالی کو اینگلو عربک اسکول دہلی میں ساٹھ روپے کی مدرسی کرنی پڑی تھی اور وہ اسی پر قانع تھے، لیکن قوم نے قدر کی اور نواب سر آسمان جاہ بہادر، مدار المہام سرکار حیدر آباد نے دولتِ آصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ[1] مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے وہی ساٹھ روپے طلب کیے جس کے تخمیناً ۷۰ روپے حالی ہوتے تھے۔

۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں ایک قطعہ نواب مذکور کو بھیجا۔ اس سے اس وظیفے کا حال اور شاعر کی خودداری بھی ظاہر ہوتی ہے:

آسماں جاہ کی خدمت میں یہ حالیؔ کی ہے عرض
کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زبان
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے
اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرمان
نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام
نہ کیا میں نے کبھی طوفِ درِ صدرِ زمان

---

[1] لیکن یہ وظیفہ نومبر ۱۸۸۸ء تک (مکتوبات۔ دوم صفحہ ۱۰۱) نہیں ملا۔ اور فروری ۱۸۸۹ء میں بھی (مکتوبات۔ دوم صفحہ ۱۱۲) یہی حال تھا۔ لیکن جون ۱۸۸۹ء تک (صفحہ ۱۱۶ ایضاً) وظیفہ جاری ہو گیا تھا۔

نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائقِ قدر
اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا
جس کے جلدو میں وہ اس لطف کا ہو شایاں
ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی
ڈھونڈھ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں
ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے جس طرح
خار و گل دونوں کو کرتا ہے نہال آبِ رواں
آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار
ملک میں اس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں
یاں وہ ان کھیتیوں کو دے کے گیا ہے پانی
آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں
قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا، نہیں محتاجِ بیاں

یہ قطعہ ۱۷ شعروں کا ہے اور نہایت سلیس زباں میں آسماں جاہ کے حقیقی اوصاف بیان کر کے دعائیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس وظیفے کے حصول میں سر سید کے "اخلاقی اثرات" کو بھی بڑا دخل تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں جب وہ حیدر آباد (دکن) پہلی بار چندے کی غرض سے گئے تھے تو اپنے رفقائے کار کے متعلق بھی اچھے اثرات چھوڑ کر آئے تھے۔ قوم کے کچھ لوگ قدر کرنے لگے

تھے اور حکومت نے انھیں یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو "نائٹ کمانڈر طبقۂ اول ستارۂ ہند" کے اعزاز سے بھی ممتاز کر دیا تھا۔ بہر حال ۱۸۸۰ء میں سر سید علی گڑھ میں حالی کی ملاقات اور سفارش سر آسماں جاہ سے کرا چکے تھے اور ۱۸۸۶ء میں آسماں جاہ سے حالی کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس کے دوسرے سال یعنی ۱۳۰۶ھ کی عید الفطر (جمعہ ۳۱ مئی ۱۸۸۹ء) کے موقع پر ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے :-

مہ صیام گیا اور روز عید آیا　　　خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

یہ چھیالیس شعر کا قصیدہ نہایت سلیس اور صاف زبان میں ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف حقیقی اوصاف بیان کیے جائیں جن کی ابتدا وہ ۱۸۸۷ء میں کر چکے تھے۔ سر آسماں جاہ کے تعلق کی اور چیزیں بھی بعد کو ملتی ہیں مثلاً ۱۳۰۸ھ میں جب ان کے یہاں فرزند تولد ہوا تو حالی نے تیرہ اشعار کا ایک قطعہ بھیجا تھا اور ۱۳۰۹ھ میں جب وہ سر سید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد دکن گئے تو وہاں بھی یہی سلسلہ قائم رہا۔ فارسی میں بھی وہ (۱۳۰۸ھ کی عید الفطر اور عید الاضحیٰ[1] کے موقعوں پر) آسماں جاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے رہے۔ اور یہ تعلق بہت عرصے تک قائم رہا[1]۔

---

[1] میر محبوب علی خاں کی اورنگ نشینی (۱۳۰۱ھ) کے موقع پر حالی نے ایک فارسی قطعہ لکھا تھا جو فارسی کلام کے ساتھ ملتا ہے۔ ۱۳۰۸ھ میں آسمان جاہ کے فرزند کی ولادت پر حالی نے ایک آیت سے تاریخ نکالی تھی جو اردو دیوان میں موجود ہے۔ اسی کے آخر میں حالی کے بھائی منظر کے لکھے ہوئے وہ فارسی قطعات بھی ہیں جو میر محبوب علی خاں کی اورنگ نشینی، ان کے فرزند کی ولادت اور میر لائق علی مرحوم کے مدار المہام ہونے سے متعلق ہیں۔

مثنوی حقوقِ اولاد:

غالباً ۱۸۸۸ء میں حالی نے "مثنوی حقوقِ اولاد" اور شکوہ ہند لکھا۔ مثنوی میں اولاد کی باقاعدہ تعلیم و تربیت[۱] نہ کرنے سے ہولناک نتائج کے متعلق ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اس میں ۳۶۰ کے قریب اشعار ہیں۔ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

لاڈلا بیٹا تھا اِک ماں باپ کا — جان ماں کی اور ایماں باپ کا
دیکھ اسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ — تھا وہی لے دے کے اس گھر کا چراغ
بال بیکا اس کا ہوتا تھا اگر — دل کو رہ جاتے تھے دونوں تھام کر
ہر طرح اس کی رضا مقصود تھی — جان تک اس کے لیے موجود تھی
وقف تھی سب اس پہ دولت اور مال — پر نہ تھا تعلیم کا اس کی خیال
روک ٹوک اس کی کسی نے کی نہ تھی — باپ نے جھڑکی تک اس کو دی نہ تھی
گھور سے واقف نہ تھا اُستاد کی — شکل دیکھی ہی نہ تھی جلّاد کی
راہ سے مکتب کی کتراتا تھا وہ — نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ

غرض کہ جب وہ اکلوتا لاڈلا بیٹا خوب بگڑ گیا تو اس کے باپ نے سمجھانے کی کوشش کی اور اس کی پرورش میں جو ناز برداری کی تھی اس کا ذکر کیا۔ باپ کے دوستوں نے بچے کے لیے جس طرح نصیحت کی تھی وہ سب حال سنایا، لیکن

---

[۱] اولاد کی بے قاعدہ تعلیم و تربیت اور بے کار رسوم و عادات کے متعلق ایک تقریر پانی پت میں کی تھی۔ مقالاتِ حالی (دوم۔ نمبر ۶) دیکھیں۔

وہ بیٹا درست نہ ہوا پھر جوانی میں قدم رکھتے ہی اس کی شادی بھی کر دی گئی اور قرض لے کر ایسی دھوم دھام کے ساتھ ناچ رنگ میں مسلسل بیس دن تک روپیہ صرف کیا کہ لوگ نظیر دینے لگے۔ لڑکا بہت بگڑ چکا تھا اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ باپ کی نصیحت اب کیونکر مفید ثابت ہوتی۔ بیٹے نے آخر باپ کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے اسی کو اپنے عیوب کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

باپ سے جوشِ جوانی میں پسر　　　باتیں یہ کہتے تو کہہ گزرا مگر
کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت　　　جرأتِ بے جا سے پچھتایا بہت
گو دیے الزام سب اپنے مٹا　　　پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا
کر کے عذرِ شوخ چشمی باپ سے　　　گر پڑا قدموں پہ آ کر باپ کے
دِل جو امڈا، دیر تک روتا رہا　　　متصل اشکوں سے منہ دھوتا رہا

اس پر باپ کا دل بھی بھر آیا اور خفت کے باوجود دوبارہ نصیحت کی۔ جس کا خلاصہ اس شعر میں ہے :-

ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر　　　اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

یہ نظم اس لائق ہے کہ ہر گھر میں بجائے بچوں کے اُن کے والدین پڑھتے رہیں اور اس سے سبق حاصل کریں تاکہ بچوں کی نفسیات کے علاوہ اپنی نفسیات سے بھی واقف رہیں۔

شکوۂ ہند :-

اس کے علاوہ اسی سال کا ترکیب بند "شکوۂ ہند" بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں تیرہ بند ہیں اور ہر بند میں گیارہ شعر ہیں۔ پہلا بند پورے ترکیب بند

کا خلاصہ ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں
آج گو شکووں سے ہیں لبریز ہم اے خاکِ ہند
ہیں مگر احسان اگلے تیرے سب خاطر نشاں
تو نے بیگانوں کی خاطر کی یگانوں سے سوا
میہماں تھے پر بنایا تو نے ہم کو میزباں
تیرے باغوں کی فضاؤں نے دیے دل سے بھلا
شعب بوّان و سمرقند و دمشق و اصفہاں
یاد کچھ جیحوں رہا ہم کو نہ دجلہ اور فرات
تیرے گنگا جل نے جب سے تر کیے کام و زباں

دوسرے بند میں ہندوستان کی دی ہوئی دولت و ثروت کا ذکر ہے۔ لیکن اپنی قومیت و ملت، رسم و عادت، زبان و معاشرت کے چھوٹ جانے کا غم بھی ہے اور تیسرے بند میں تمام خاص خاص اسلامی محاسن کا ذکر ہے جو ہندوستان میں آکر ختم ہو گئے۔ چوتھے، پانچویں اور چھٹے بند میں بھی عام محاسن کے ختم ہو جانے کا حال ہے۔ پھر مختلف بند ایسے ہیں جن میں مختلف اوصاف کے متعلق خصوصیت کے ساتھ بحث ہے۔ مثلاً اسلامی غیرت و حمیت، خدمتِ مہمان و ہمسایہ، محبت و صداقت، برادرانہ مساوات، راستی و صدقِ گفتار، دفورِ علم و حکمت وغیرہ۔ آخری بند میں مولانا حالی نے گویا پیشین گوئی کی ہے جو اس زمانے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی :-

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی
بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

گو یقیں ہے رفتہ رفتہ یادِ ایامِ سلف
دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردشِ دورِ زماں

پر زمانے میں رہیں گے تا قیامت یادگار
جو کیے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں

ماجرا ہوگا ہمارا عبرت اوروں کے لیے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں

سانپ سے جس طرح رہتا ہے سپیرا دُور دُور
حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں

برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت

عرضِ حال :

اس پورے ترکیب بند میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کا حال کچھ اس انداز میں ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے اور شاعر کے آرٹ کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسی درد کے متعلق ایک "عرضِ حال" ہے جو سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ کی جناب میں پیش کی گئی ہے اور جس کی شہرت و مقبولیت ہر جگہ ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے :-

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نِکلا تھا وطن سے
پردیس میں وُہ آج غریب الغُربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دِیا ہے

اس "عرضِ حال" کے اشعار حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کی طرح ۶۳ ہیں اور اپنے اندر عجیب سوز و گداز اور درد و اثر رکھتے ہیں۔ چند اشعار بغیر خاص انتخاب کے دیکھیے اور آسان قافیوں کی بلاغت ملاحظہ فرمائیے:۔

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مِٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

یاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے
اور سکّہ رواں شہر میں مدّت سے نیا ہے

فریاد ہے اے کشتیِ اُمّت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمۂ رحمت ، بابی انت و امّی
دُنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے

کر حق سے دُعا اُمّتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

اُمّت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دل دادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہماری نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں

پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے[۱]

بارگاہِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) سے یہ "عرضِ حال" کیا نتائج بر آئی ہوگی یہ خدا ہی جانتا ہے، لیکن خود پڑھنے والے کے دل پر جو اثر اور نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ اگر دین کو تازہ کرنے کے لیے کافی ہے تو ساتھ ہی ساتھ حالی کے کمالِ شاعری کے لیے بھی اتمامِ حجت ہے۔

مکتوباتِ حالی حصہ اول (ص ۱۲۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی شروع جنوری ۱۸۸۷ء میں لاہور گئے اور (چیفس واچیسن) کالج میں رہے۔ مکتوبات حصہ دوم (ص ۹۵) میں مارچ والا خط بھی اسی (اچیسن) کالج کا ہے جہاں وہ (ص ۱۰۱) جون ۱۸۸۷ء کے پہلے ہفتے تک رہے۔ لاہور کے پہلے قیام میں (۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء تک) وہاں کی آب و ہوا سے گھبراتے تھے۔ اس لیے اس مرتبہ کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں مثلاً پیچش اور ڈاڑھ کا درد (ص ۹۶) بھی ان کو پریشان کر رہا ہوگا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کی اسسٹنٹ رجسٹراری (ص ۹۷) اگر مل جاتی تو شاید لاہور میں کچھ قیام زیادہ ہو جاتا لیکن جی نہیں لگا اور وہ ۵-۶ جون ۱۸۸۷ء تک (ص ۲۱) دہلی کے لیے روانہ ہو گئے بلکہ وہاں بھی پہنچتے ہی چھ ماہ کی رخصت لینے کا ارادہ (ص ۱۰۱) بھی کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں ہیضہ اور بخار (ص ۱۰۲) پھیلا ہوا

---

[۱] آخر میں ایک شعر ہے:-

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے   باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلہ ہے

شکوۂ ہند کے علاوہ ایسے اشعار بھی اقبال کو شکوہ لکھنے پر آمادہ کر سکتے تھے۔

تھا۔ مولانا بھی تین دن (ستمبر ۱۸۸۷ء) تپ میں مبتلا رہے (صہ ۱۰۲) پھر نومبر ۱۸۸۷ء (صہ ۱۰۳، ۱۰۴) میں نزلہ وغیرہ سے پھر بیمار ہو گئے اور تین ہفتے کی رخصت پہلے لینی پڑی (۱۱ر دسمبر صہ ۱۰۴) اور بعد میں اضافہ کرانے کا خیال بھی تھا۔ عمر بھی اب ۵۰ سال کی ہو چکی تھی۔ سر سید اسی زمانے میں انھیں لکھنؤ میں محمڈن کانگریس میں شرکت کے لیے (صفحہ ۱۰۴) لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں جانے کے قابل حالت نہیں تھی۔ دہلی میں مارچ، اپریل ۱۸۸۸ء (صہ ۱۰۶) میں بھی بیمار تھے۔ ماہ مئی ۱۸۸۸ء میں (رمضان ۱۳۰۵ھ) پانی پت جانے کا ارادہ تھا۔ ضعف اور کھانسی تھی۔ پھر بھی، (صہ ۱۰۸) وہاں رمضان میں چلے گئے۔ وہاں مکان بھی بنوانا شروع کر دیا (صہ ۱۰۸) میں ستمبر ۱۸۸۸ء کے آخر میں دہلی آ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی (صہ ۱۰۹) کھانسی کی شدت ہو گئی۔ رخصتِ علالت لینے کا ارادہ کیا، لیکن پانی پت میں مکان کا کام بھی ابتر ہو رہا تھا۔ آخر ایک ماہ کی رخصت اور مل گئی (صہ ۱۰۹) اسی رخصت میں ۲۰ر نومبر ۱۸۸۸ء کو علی گڑھ (تقریب تشریف آوری لارڈ ڈفرن وائسرائے) جانے کا ارادہ تھا۔

۱۸۸۹ء

ایک ارادہ:

اس وقت تک حیدر آباد کا وظیفہ نہیں ملا تھا (صہ ۱۱۱) بلکہ فروری ۱۸۸۹ء تک (صہ ۱۱۲) اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ مئی ۱۸۸۹ء میں رمضان شریف کے موقع پر (صہ ۱۱۵) پانی پت چلے گئے۔ وہاں ریل نکلنے کے سبب راج مزدور بہت

گراں ملتے تھے اس لیے مکان کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی تھی۔ عید الفطر کے بعد ماہِ جون ۱۸۸۹ء میں جب دہلی واپس پہنچے تو حیدرآباد کا وظیفہ جاری ہو گیا تھا اور گیارہ مہینے کی تنخواہ بھی وصول ہو چکی تھی (صد ۱۱۶) اسی لیے اب وہ پچھلی ملازمت سے استعفیٰ دے رہے تھے اور اس کے لیے درخواست کا مسودہ پیارے لال (آشوب ؟) کو درست کرنے کی خاطر بھیجا تھا، لیکن جولائی ۱۸۸۹ء میں (صد ۱۱۸) انھوں نے بجائے استعفیٰ دینے کے ایک سال کی رخصت بلا تنخواہ طلب کی تھی اور یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ دہلی میں ایک بہت بڑا مطبع قائم کیا جائے جس میں ہندوستان کے عمدہ[۱] مصنفین کی کتابیں چھپوائی جائیں اور جو چھپ چکی ہیں ان کو نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جائے۔

بیماریاں :

۱۳ر اگست ۱۸۸۹ء کو مولانا حالیؔ دہلی سے پانی پت چلے گئے (صد ۱۱۹) لیکن بیماریوں میں مبتلا رہے[۲] (صد ۴) پھر یکم نومبر سے غالباً ۲۲ر نومبر ۱۸۸۹ء تک (صد ۱۲۲) علی گڑھ میں سر سیّد کی کوٹھی میں ٹھہرے لیکن صاحبزادی کی بیماری کی وجہ سے پھپھوند جانا پڑا۔ پھر واپسی میں دوبارہ علی گڑھ گئے تاکہ وہاں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس میں آخر دسمبر ۱۸۸۹ء میں شرکت کریں۔ وہاں سے دہلی ہوتے ہوئے ۲۶ر جنوری ۱۸۹۰ء کو (صد ۱۲۳) پانی پت پہنچے، لیکن علیل ہو گئے۔ رجب ۱۳۰۷ھ کے آغاز میں

سلہ مولانا شبلی نے بھی ۱۸۹۲ء میں قدیم کتابوں کی اشاعت کا خیال ظاہر کیا تھا، حیاتِ شبلی (صد ۲۴۴) دیکھیں

سلہ اس زمانے میں کسی نے مولانا کی کسی تحریر کے خلاف مضمون لکھا تو بہت خوش ہوئے (مکتوب ۲ صد ۵)

(فروری ۱۸۹۰ء کے آخر میں) پانی پت کے نئے مکان میں منتقل ہوئے (ص ۱۲۴) اور اب وہیں رہنے لگے۔ البتہ چند روز کے لیے ماہِ جون میں (ص ۱۲۶) دہلی گئے تھے اور ۲ جولائی کو شملہ سے واپس ہوئے (ص ۱۰۱) بہرحال مستقل قیام اب پانی پت ہی میں تھا۔ وہاں اگست ۱۸۹۰ء میں بے انتہا بارش ہوئی کہ ویسی کبھی نہ دیکھی تھی (ص ۱۲۷) نومبر میں نزلہ میں پھر مبتلا ہو گئے (ص ۱۲۹) اور کسی کے مشورے سے افیون کھانی شروع کی، لیکن اس سے اور طرح کی تکلیفیں شروع ہو گئیں۔ دسمبر ۱۸۹۰ء[۵۱] کے آخر میں ایجوکیشنل کانگریس شرکت کرنے کے لیے الٰہ آباد (ص ۱۳۰) جانے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ اس کانگریس کا پانچواں اجلاس تھا۔ وہاں سے واپسی پر پھر بواسیر کی شکایت زیادہ ہو گئی (ص ۱۳۴)

مسلمانوں کی تعلیم:

آخر دسمبر ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس[۵۲] کے چوتھے اجلاس کے موقع پر ایک ترکیب بند "مسلمانوں کی تعلیم" پڑھا۔ اس میں بارہ بند ہیں۔ اس کے اشعار کی ترتیب عجیب طرح کی ہے۔ آخری اشعار کے علاوہ پہلے بند میں آٹھ شعر، دوسرے تیسرے، چوتھے اور پانچویں بند میں نو نو شعر ہیں۔ چھٹے میں دس شعر۔ ساتویں اور

---

۵۱ ۴ دسمبر ۱۸۹۰ء کے خط میں (مکتوبات ۲، ص ۳۹) مولانا کی ایک رباعی ملتی ہے:-

تیمور نے ایک مورچہ زیرِ دیوار — دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام رے کے پہنچا تو کہا — مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

۵۲ پہلی کانفرنس ۱۸۸۶ء میں سر سید نے قائم کی تھی۔ ۱۸۸۸ء تک وہ کانگریس کہلاتی تھی مگر انڈین کانگریس کی وجہ سے کانفرنس ہو گئی۔

آٹھویں میں پھر نو نو شعر ہیں اور نویں بند میں دس، دسویں میں گیارہ، گیارہویں میں بارہ اور بارہویں میں انیس شعر ہیں۔[1] بہر حال وہ ترکیب بند اس طرح شروع ہوتا ہے :-

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو

سنے ہوں گر نہ معنی لاتسبّوا الدھر کے تم نے[2]
تو اب سُن لو کہ ہوں میں شانِ ربّانی مجھے مانو

وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو
خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو

گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے
بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو

گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یاں عیش کرتے تھے
ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو

مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں
یہ سودا کب تک اے شمعِ سحر گاہی کے پروانو

---

[1] یہ بھی ممکن ہے کہ جو ترکیب بند مجھے مل سکا ہے اس کے خلاف دوسرے نسخوں میں اشعار کی تعداد دوسری ہو۔

[2] اس حدیث کے علاوہ درمع الدہر کیف مادار۔ شکوۂ ہند یعنی حالی والا شکوہ اور حالی والا قومی درد کسی نہ کسی شکل میں اقبال پر اثر انداز ہوتا ہے۔

دوسرے اور تیسرے بند میں تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر اشعار ہیں چوتھے بند میں تعلیمی جذبات کے سلسلے میں سرسید کے احسانات کا ذکر ہے۔ پانچویں، چھٹے، ساتویں اور آٹھویں بند میں بھی سرسید کی قومی اور تعلیمی خدمات اور ان کی مقبولیت کا حال ہے۔ نویں بند میں قوم کے متحد ہونے کے لیے نصیحت ہے۔ کیونکہ:-

نظر آتا نہیں یاں حملۂ دوراں سے بچنے کا
سوا اک درس گاہِ قوم کے کوئی حصار اب تک
کرو پورا حصارِ قوم کو سر جوڑ کر یارو
ہٹاؤ حملۂ دوراں کو سب جی توڑ کر یارو

دسویں بند میں "دار العلوم" علی گڑھ کی اہمیت کا ذکر ہے اور بقیہ دو بند وہاں کے اقامتی اور تدریسی حالات کے متعلق ہیں کہ وہاں کے طلبہ کی دینی حمیت، باہمی محبت اور اعلیٰ تربیت کیا ہے۔ وہاں باغی عناصر بھی نہیں ہیں بلکہ سلطنت کی پوری اطاعت ہے۔ وہاں کے اساتذہ بھی بہت اچھی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ انگریز اساتذہ نے طلبہ کی تعلیم اور سرپرستی میں جو حصہ لیا ہے ان کی تعریف بھی ہے اور اپنے ملک کے جو فضلا وہاں موجود ہیں ان کا جامع تعارف اس طرح ہے:-

دمِ تدریس دیکھیں چکروَرتی کو اگر برسوں
نہ پیشانی پہ بل دیکھیں، نہ ابرو میں شکن دیکھیں
ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلیؔ[1] سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں

---

[1] شبلی کا تقرر علی گڑھ میں جنوری ۱۸۸۳ء کو ہوا تھا اور وہاں مئی ۱۸۹۸ء تک پروفیسر رہے

اگر بو جعفر طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں

تو عباس ابنِ جعفر سا محیطِ علم و فن دیکھیں

مولانا نے اپنے اشعار سے قوم کو علی گڑھ کے دارالعلوم کی اہمیت سمجھائی ہے اور سر سیّد کے احسانات کا حال تفصیل کے ساتھ سنایا ہے۔

ترجیع بند برائے طلبہ:

اسی دسمبر ۱۸۸۹ء کے آخر میں دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں پنجاب کے گورنر سر جیمس براڈ ووڈ لائل آنے والے تھے اس موقع پر مولانا حالی نے وہاں کے طلبہ کی طرف سے ایک ترجیع بند (سات بند کا) لکھ کر پانی پت سے بھیجا تھا۔ (مکتوبات حصہ دوم صہ۶) وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

نہیں قلم اور زباں میں طاقت کہ ہو بیاں آج کی مسرّت
کہاں یہ اس مدرسے کی قسمت کہ لائیں تشریف خود بدولت
کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ ان پر خدا کی برکت
کریں ادا شکر اس کا ہم کیا کہ قیمتی وقت کھو کے اپنا
ہماری حالت کو تم نے دیکھا تمھی کو فرماں دہی ہے زیبا

(بقیہ صہ۱۲۱) رہے ۱۸۹۹ء میں شبلی جب کشمیر گئے تو وہاں سخت بیمار ہو گئے اور مشکل سے صحت پائی حالی نے ایک فارسی قطعۂ تہنیت لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز شبلیِ ما بمراد از سرِ بالیں برخاست

کریں غریبوں پہ جو عنایت
ہمیشہ اُن پر خدا کی برکت

۱۸۹۱ء

حیدرآباد کا سفر:

۱۸۹۰ء میں مولانا کئی بار بیمار ہوئے (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے)[1] اس لیے ان کی کوئی ادبی یادگار اس سے متعلق نظر نہیں آتی۔ ۱۸۹۱ء میں بھی وہ بیمار تھے (مکتوبات حصۂ دوم صفحہ ۱۳۴-۱۳۷) تاہم ہمت کر کے ۱۳ مئی ۱۸۹۱ء (ص ۱۳۸) کو وہ پانی پت سے دہلی آئے بازو میں درد بہت تھا۔ اسی حالت میں (ص ۱۳۹) علی گڑھ جون کے وسط میں آئے۔ وہاں ڈاکٹر سے پلستر لگوایا۔ پھر ۷ ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ (۱۴ جولائی ۱۸۹۱ء) کو علی گڑھ سے دہلی (ص ۱۳۹) روانہ ہوئے اور ۹ ذی الحجہ کو پانی پت پہنچے۔ لیکن سرسید کا خط آیا کہ حیدرآباد ضرور چلیں اس لیے ۲۳ اگست ۱۸۹۱ء کو وہ علی گڑھ گئے۔ (ص ۱۴۰) اور اسی رات کو سرسید کے وفد کے ساتھ حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔ وفد میں سرسید اور حالی کے علاوہ (ص ۱۴۱) مولوی ذکاء اللہ، حاجی اسمٰعیل خاں، مولوی زین العابدین خاں اور ان کے صاحبزادے زین الدین خاں، مولوی شبلی، قاضی رضا حسین خاں عظیم آبادی، احمد علی (برادر سید محمد علی) شامل ہوئے۔ حیدرآباد پہنچتے ہی اکثر لوگ بخار اور لرزہ میں مبتلا ہو گئے (ص ۱۴۲) چونکہ وہاں سے نقد روپیہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ وصول ہونے کی امید تھی۔ اس لیے وہاں مولانا حالی نے ایک قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے کے حاشیے پر وہ خود لکھتے ہیں کہ:-

---

[1] ۱۴ دسمبر ۱۸۹۰ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص ۳۰) ایک باعی یادگار ہے جس کا ذکر ص ۱۱۱ کے حاشیے پر آچکا ہے۔

"ماہِ ستمبر ۱۸۹۱ء مطابق صفر ۱۳۰۹ھ میں بمقام حیدرآباد (دکن) جبکہ ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر مع اکثر رفقاء کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا، بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڑھ کی طرف سے سرکار نظام (میر محبوب علی خان) میں حاضر ہوئے تھے۔ ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا جس کے صدرِ انجمن جناب نواب وقار الامراء بہادر تھے۔"

قصیدہ:

قصیدہ[1] اس طرح شروع ہوتا ہے:-

اے صفر کی دوسری روزِ دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہم نے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اس کے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکرِ خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آکے بلدہ کے سوا۔۔۔۔ میں لگا اس کا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گئے ہیں دو بلدہ دیتے صدا

---

[1] مولانا شبلی نے بھی اس موقع پر ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا جس میں منظر کشی بہت خوب ہے:-

پس بفرمودۂ دانش زعلی گڑھ آخر — کارواں شد سوئے اقلیم دکن راہ گرائے

پہنچے لینے ان کو وہ اعیان دار الملک سے
دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے افتخار

اِس قصیدے میں ۴۵ شعر ہیں۔ پہلے دکن والوں کی تعریف ہے جس میں میر محبوب علی خاں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ وکٹوریا کی تعریف بھی ہے۔ پھر سر سید کی خدمات کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد حیدر آباد کی سخاوت کے جذبے کو اُبھارا ہے اور خصوصیت کے ساتھ صدرِ اعظم کی تعریف ہے۔ اس قصیدے کے بعد صدرِ اعظم نواب وقار الامرا نے مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں کو خاص طور پر اپنے دولت کدے[1] پر بلوایا وہاں بھی حالی نے ایک قطعے کی شکل میں چند اشعار لکھے:۔

قطعات:

یاں بُلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے
اوّل اس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں
خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر
جو لیاقت اس میں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکارِ عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں

---

[1] اس واقعے کا ذکر مولانا حالی نے اس قطعے کے حاشیے میں کیا ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔

گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور
درگزر فرمائیں گے سرکار اس سے، ہے یقیں

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں

اور اس کے بعد مولانا حالیؔ کے وظیفے میں اضافہ ہو گیا اور پچھتر روپے[۵۱] حالی سے ایک سو حالی ہو گئے۔ چنانچہ شکریے کے اظہار میں سات شعر کا ایک قطعہ لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

اے بشیرِ دولت و دیں نائبِ شاہِ دکن
اے مہمّاتِ دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

اس کے بعد ربیع الاوّل ۱۳۰۹ھ (اکتوبر ۱۸۹۱ء) کے آخر میں (مکتوبات حصّہ دوم ص ۱۴۳) مولانا حالی حیدر آباد سے واپس ہوئے۔ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں (ص ۱۴۵) فیاض حسین کی آنکھ بنوانے کے لیے جھانسی گئے اور آخر ہفتے میں

---

[۵۱] "چند ہم عصر" (عبدالحق) تذکرہ حالی۔ (مکتوبات حصہ دوم۔ ص ۱۴۲) میں بھی اس کا ذکر ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ رقم کمپنی کے روپیوں سے بیاسی تراسی ہو گی۔ وقار الملک کی کوشش کا ذکر بھی ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس کے لیے علی گڑھ گئے۔ وہاں ایک ترکیب بند پڑھا اس میں سات بند ہیں اور آخری بند (جس میں سولہ اشعار ہیں) کے علاوہ ہر بند میں چودہ چودہ شعر ہیں۔ ترکیب بند کے حاشیے میں مولانا لکھتے ہیں:۔

ترکیب بند:

"اس نظم میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقراء اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے اور متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف اچھے دولت، عزت اور نیک نامی یا علم وفضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے، یا چاہتے ہیں مگر وہ بڑھ نہیں بڑھ سکتے۔ اعلیٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت وحشمت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔"

بس اسی مواد کو مولانا حالی نے اس نظم میں پھیلا کر پیش کر دیا ہے۔ ترکیب بند اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیونکر زباں
تُو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
جب ہوئے بھوکے تو بخشی تُو نے نان و نا خورش
پر نہ اتنی معدہ و احشا پہ گذرے جو گراں

جب مجھے پیاس ہے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک
پر نہ ایسا جو صراحی جس کی یاروں سے نہاں

پہلے بند میں متوسط طبقے کا ذکر ہے۔ دوسرے بند میں ادنیٰ درجے کے لوگوں کا حال ہے اور تیسرے بند میں اعلیٰ درجے والوں کی کیفیت ہے جن کا ذکر اوپر حاشیے میں آچکا ہے۔ لیکن متوسط طبقے کی درمیانی زندگی سب کو پسند ہے مولانا حالی کہتے ہیں:

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری
چین ہے دُنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے
یہ جو ہے برزخ میانِ مسکنت و دستِ تہی

اسی طبقے کی تعریف میں بقیہ بند ہیں۔ آخری بند میں کہتے ہیں:

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاقِ قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
مال و دولت نامبارک ہے، نہ ہو اگر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی
دیگ تو پکتے ہی پکے گی دھیمی آنچ میں
کچھ اُبال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی
انجمن ہے قوم کی، ہنگامۂ شادی نہیں
ایک دن کا کام، کچھ رُوما کی آبادی نہیں

سنہ ۱۸۹۲ء

حکیم محمود خاں کا مرثیہ:

اس سال کے ان ادبی شہ پاروں کے علاوہ کوئی اور چیز یادگار نہیں ہے۔[1] البتہ سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق سنہ ۱۸۹۲ء کی لکھی ہوئی کئی چیزیں ملتی ہیں لیکن اس سال کی ان کی پریشانیاں بہت تھیں۔ کانفرنس میں اوپر والے ترکیب بند کے پڑھنے کے بعد ۷ جنوری سنہ ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے روانہ ہوئے (مکتوبات دوم۔ صفحہ ۱۴۶) اور دہلی ہوتے ہوئے ۱۲ جنوری کو پانی پت پہنچے۔ علی گڑھ جلد واپس جانے کا ارادہ تھا اور واپسی کا ریلوے ٹکٹ بھی لے آئے تھے لیکن ۱۷ جنوری کو عبدالعلی سخت بیمار ہو گئے اور بھی خانگی پریشانیاں تھیں۔ پھر مارچ میں دوسرے اعزا کے ساتھ خود بھی انفلوئنزا میں سخت بیمار رہے (صفحہ ۱۴۷) اور بہت زیادہ کمزور ہو گئے۔ اپریل میں بھی (صفحہ ۱۴۸) یہی حالت رہی، لیکن آب وہوا تبدیل کرنے کی خاطر مئی میں کوہ ناہن (مطبع سومور گزٹ) چلے گئے (صفحہ ۱۴۹) اور وہاں مئی جون اور جولائی میں اپنے دیوان اور اس کے مقدمے کی ترتیب[2] میں مشغول ہو گئے (صفحہ ۱۵۱)

---

[1] سنہ ۱۳۰۹ھ کا لکھا ہوا فارسی میں ایک قطعہ دس شعر کا ضرور ملتا ہے جو سید محمود علی ابن سید بر علی (بھتیجہ سر سید احمد خاں) کی ناگہانی موت پر لکھا گیا تھا:۔ ؎

زبدۂ اتراب و شمع جمع محمود علی   آنکہ در باغِ شبابش بود آغازِ بہار

لیکن یہ موت غالباً ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۹ھ (مئی سنہ ۱۸۹۲ء) میں واقع ہوئی ہوگی جیسا کہ مکتوب (دوم۔ صفحہ ۱۵۰) سے واضح ہوتا ہے۔

[2] مقدمہ لکھنے کے لیے لندن کا عربی رسالہ "نخلہ ادبیہ" بھی دیکھنا چاہتے تھے جس کی فائل ان کے گھر پر موجود تھی (مکتوبات دوم۔ صفحہ ۱۵۱) اسی رسالے کے لیے انھوں نے عربی میں سر سید

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۳۵)

اس زمانے میں وبائی امراض بہت پھیلے ہوئے تھے اس لیے اعزا ان کے متردد رہتے تھے۔ غالباً جولائی ۱۸۹۲ء کے آخر میں وہ پانی پت واپس آ گئے تھے۔
اسی زمانے میں حکیم محمود خاں دہلوی کا انتقال ہوا ہو گا۔ کیونکہ ان کی وفات پر جو مرثیہ انھوں نے لکھا تھا اس کے طبع ہونے کے متعلق ستمبر ۱۸۹۶ء والے خط میں ذکر ہے اور (ص ۱۵۳) ۱۴ اکتوبر والے خط میں لکھتے ہیں کہ مرثیہ چھپ کر آ گیا ہے۔
یہ مرثیہ مسدس کی شکل میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

اے جہاں آباد اے اسلام کے دار العلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا اضافہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

اس مسدس میں ۷۴ بند ہیں۔ شروع کے دس بند دہلی کے مختلف علوم و فنون کی جامعیت اور عام شہرت سے متعلق ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:۔

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی

(بقیہ ص ۱۲۹) سرسید کے حالات اور خدمات پر (ص ۱۴۳) مضمون لکھا تھا لیکن اس کے بہت سے اوراق ضائع ہو گئے۔ جتنے بچ گئے وہ بعد میں ضمیمہ کلیات حالی میں شائع ہوئے۔ مقدمہ کے مطالب کی ترتیب مولانا حالی کے ذہن میں ۱۸۸۲ء سے تھی جیسا کہ ۹ جنوری ۱۸۸۲ء والے خط میں (مکتوبات اول۔ ص ۱۴۱) ذکر ہے۔ اس کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

پھر مرحوم کے مختلف اوصاف کا ذکر ہے۔ یعنی طب یونانی میں کمال، راستی و راست بازی، غدر کی مصیبتوں کے زمانے میں مظلوموں اور غریبوں کی امداد، دیانتداری وضعداری، ہر حالت میں صبر و تحمل اور خوشی کا اظہار وغیرہ، بہت سے اوصاف بیان کیے ہیں۔ آخر کے دو بند ہمارے اردو شعراء کی ذہنی پستی اور ماحول کی اثراندازی کے متعلق ہیں گو کہ وہ بہت کچھ صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالی اس طرح لکھتے ہیں:

سنتے ہیں حالی، سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخن ور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوّف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

یہ بند مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی ترتیب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی تیاری میں وہ اسی زمانے میں مصروف تھے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

دہلی کے عمائدین نے خواہش کی کہ یہ مرثیہ خود مولانا حالی کی زبانی جلسۂ عام میں سنا جائے۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء بروز یک شنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدرالدین خاں مرحوم کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ مرثیہ پڑھنے سے پہلے "مرثیہ لکھنے کی ضرورت" پر ایک تقریر بھی انھوں نے کی جو مقالاتِ حالی حصۂ دوم میں موجود ہے۔ اس تقریر میں عرب کے بعض مرثیہ نگاروں کا ذکر ہے۔ پھر کربلا سے متعلق مرثیوں کی خوبیاں بیان کی ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں :-

"اس زمانے میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہو گئی ہے اور تمام جماعتوں میں تفرقے پڑے ہوئے ہیں ان میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی ازبس ضرورت ہے۔ جہاں اس کی اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمتگزار گذر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جائیں۔ اس کی خوبیاں اور اس کے محاسن ملک میں شائع کیے جائیں اور شعرا جو کہ قوم کی زبان ہیں تمام قوم کی طرف سے ان کے مرثیے لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے"

اسی خیال کا پرتو اس مرثیے کے آخری بند میں بھی ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

عملی نقاد کے فرائض:

اسی زمانے میں مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان[1] دوبارہ چھپ کر آئی۔ اس پر حالی نے ریویو لکھا اور "عملی نقاد" کے فرائض پر بھی بحث کی۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے نزدیک ریویو نگاری کا منصب صرف اس بات کا دیکھنا ہے کہ مصنف نے وہ فرائض جن کو زمانے کا مذاق ہر نئی تصنیف میں اس طرح ڈھونڈتا ہے جس طرح پیاسا پانی کو، کس حد اور کس درجے تک ادا کیے ہیں۔ پس جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہوں ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیاتِ مسائل میں فی نفسہٖ کیسی ہے۔ کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے، نہ ریویو لکھنے والے کا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوانِ بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریقِ استدلال مذاقِ وقت کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی غایت جو مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیے یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟

مولانا کی یہ بحث بہت اہم ہے اور عملی تنقید کی تاریخ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اس نظریے کے مطابق سیرت النعمان پر مولانا کا ریویو ہے اور اس کتاب کی "جزئیاتِ مسائل" پر "مصنف کی رائے" سے جہاں تک مولانا کو

---

[1] یہ کتاب ۱۸۹۱ء کے آخر میں پہلی بار چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ پھر اپریل ۱۸۹۲ء میں دوبارہ چھپ رہی تھی۔ ملاحظہ ہو حیاتِ شبلی ص ۱۸۰۔

اختلاف ہو سکتا تھا اس سے بڑی خوبی کے ساتھ پہلو بچا کر گزر گئے ہیں اور اس کام کو "پبلک" کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اب ریویو میں کیا ہو گا؟ یہی کہ "سادگی اور بے ساختہ پن جو عموماً ہر تحریر کی جان اور خاص کر بیوگرفی کا ایمان ہے وہ اس مصنف کی ہر تصنیف میں ترقی پا رہے ہیں"۔ ایسی تصنیف کی ترتیب پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس بزرگ کی لائف لکھی جاتی ہے اگر اس کے متعلق پہلے کچھ نہیں لکھا گیا تو مصنف کو "نہایت سخت عقبات سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ وہ ابواب و فصول بالکل نئے ڈھنگ سے مقرر کرتا ہے ..." یہاں مولانا پھر پہلو بچا رہے ہیں اور یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حیاتِ سعدی کی ترتیب کا بہت کچھ اثر اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے بعد پھر بڑے لطیف پیرائے میں سیرۃ النعمان کے ایک نقص کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "اس کتاب میں جو استدلال، نقل و روایت سے کیا گیا ہے گو وہ مخالفت پر حجت نہ ہو سکے، لیکن مخالفین کی تسلی کے لیے کافی و وافی ہے۔" اتنا کہہ کر ایک بہت بڑی بات مولانا شبلی کے استدلال کے متعلق یوں کہہ دی کہ "ایسے طریقۂ استدلال سے ہمارے لٹریچر میں فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔" یہاں پھر مولانا اپنی اس درایت اور طریقۂ استدلال کو پسِ پشت ڈالنا چاہتے ہیں جو انھوں نے انبیاء، زمانہ "الدین لیسر" وغیرہ میں برتا ہے۔ پھر مولانا حالی نے مولانا شبلی کے استدلال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انھوں نے کمالِ لیاقت سے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کی وجہ سے فقۂ حنفی کو تمام فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔

بایں ہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب کی تکمیل کے لیے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک

آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے"۔ یہاں بھی نہایت لطیف انداز میں فقہ حنفی[1] کی خصوصیات پر مزید روشنی ڈالنے کے متعلق مولانا اشارہ کر رہے ہیں۔

اکتوبر ۱۸۹۲ء[2] میں اخبار رفیقِ ہند میں "اخبار نویسی اور اس کے فرائض" پر مضمون لکھا اور اس میں اس زمانے کے اخباروں کا حال بڑی جامعیت سے لکھا کہ "جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں، جہاں ظرافت اور مسخرگی اور استہزا، واقعات اور حقائق سے زیادہ مرغوب ہوں، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر پھبتیاں کہنا داخلِ حسنِ بیان سمجھا جائے، جہاں گورنمنٹ پر بے جا اور اندھا دھند نکتہ چینی کرنے کا نام آزادی رکھا جائے، وہاں باوجود آزادی، انصاف و دیانت کے پبلک کے دلوں کو مسخر کرنا قریب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔" پھر اخباروں کے نہ چلنے کے اسباب بیان کیے ہیں کہ یا تو ایڈیٹر لائق نہیں ہوتا، یا اس میں پبلک کا صحیح مذاق نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ایک لائق اخبار نویس کے فرائض بیان کیے ہیں اور آخر میں بتایا ہے کہ "ان سب کا اصل اصول، راستی اور سچائی ہے اور یہ ایسا صاف سیدھا، پُرامن اور بے خطر رستہ ہے جو نہایت آسانی سے بے زحمت و مشقت طے ہوتا ہے اور کبھی منزلِ مقصود پر پہنچانے میں خطا نہیں کرتا۔"

۱۴ نومبر ۱۸۹۲ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص ۱۵۶) مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] بعد میں نواب عماد یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شروانی مرحوم نے بھی ایک رسالہ اس پر لکھا تھا۔

[2] ۲۴ ستمبر ۱۸۹۶ء کے خط میں (مکتوبات حصہ دوم صفحہ ۱۵۲) لکھتے ہیں کہ "میں وہی تفسیر پر ریویو لکھ رہا ہوں۔ ابھی ختم نہیں ہوا"۔ یہ ریویو غالباً سرسید کی تفسیر کے متعلق تھا۔ جو مقالاتِ حالی حصہ اول میں نمبر ۲ ہے۔

"چودہ روز سے بخار ایک دم بھر کو نہیں اترا سارے دن اور رات پڑا رہتا ہوں"

ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے ترکیب بند:

۱۰ دسمبر کے خط میں (صفحہ ۱۵۴) اپنے اچھے ہونے کے متعلق لکھتے ہیں، لیکن نقاہت کی وجہ سے خود کو سفر کے لائق نہیں سمجھتے۔ لکھتے ہیں کہ "میں اچھا ہوں مگر دلی آنے کے قابل شاید ۲۴ یا ۲۵ دسمبر تک ہوں تو ہوں" ایسی حالت کے باوجود انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس (منعقدہ دہلی) کے لیے ترکیب بند لکھا۔ اس میں کل چار بند ہیں اور آخری اشعار کے علاوہ شروع کے دو بند، پندرہ اشعار پر مشتمل ہیں اور بقیہ دو بند چودہ چودہ اشعار کے ہیں۔ شروع اس طرح کرتے ہیں:-

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہلِ آرا

ہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں

آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا

اس بند میں مسلمان بادشاہوں کی شان و شوکت کا ذکر ہے پھر کہتے ہیں:-

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں

پر جشن ان کے اب تک سب نے بیاں ہیں

۱؎ مکتوبات دوم صفحہ ۱۵۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ترکیب بند میں کچھ مواد ایک کتاب "بزم آخر" سے لے کر شامل کرنا چاہتے تھے اور تقاضا تھا کہ ۱۰ دسمبر تک وہ کتاب مل جائے تاکہ لال قلعہ دہلی کے دستور اور رسوم وغیرہ بھی اس میں سے لے کر نظم کر دیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وقت پر نہیں آسکی۔

دوسرے بند میں اس قومی جشن (ایجوکیشنل کانفرنس) کی عظمت کا ذکر ہے۔ تیسرا بند بھی اس کی اہمیت اور ضرورت کے متعلق ہے۔ آخری بند میں سر سیّد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

اک خضرِ رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے — رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
خدمت میں ان کی حالیؔ کہتا ہے یہ ادب سے — اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں
دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو — ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں — قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں
جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں[1]

سنہ ۱۸۹۳ء

جنوری ۱۸۹۳ء کے پہلے ہفتے تک (مکتوبات - دوم صفحہ ۱۵۵) مولانا دہلی میں تھے۔ کھانسی کی شکایت تھی اور دوسری شکایت بواسیر کی تھی جس میں وہ (ص ۱۵۵) چالیس برس کی عمر سے مبتلا تھے۔ کھانسی زکام ان کو اکثر ستاتا تھا۔ ۱۲؍ مئی ۱۸۹۳ء کو پانی پت سے روانہ ہو کر (ص ۱۶۱) دہلی ہوتے ہوئے، ۲؍ مئی کو علی گڑھ پہنچے اور وہاں یونین کلب[2] کے پاس کی بنگلیا میں مقیم ہوئے۔ جون ۱۸۹۳ء میں ان کی طبیعت درست ہوتی جا رہی تھی (ص ۱۶۲) اور شروع جولائی تک (ص ۱۶۵) بالکل اچھے

۱؎ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اس موقع پر نظم لکھی تھی:-

مسلمانو اگر تم میں ہے کچھ فکرِ رسا باقی — تو بول اٹھو کہ ہے اسلام کے مٹنے میں کیا باقی

۲؎ اسی کا ذکر مولانا عبد الحق نے "چند ہم عصر" میں (حالی) کیا ہے۔

ہو چکے تھے۔ علی گڑھ پہنچنے پر مئی کے مہینے ہی میں ان کا دیوان (ص ۱۶۸) چھپنا شروع ہو گیا تھا، لیکن بہت سا مسودہ باقی تھا۔ اگست تک (ص ۱۶۷) نظم کے تمام مسودات دہلی میں بھیج چکے تھے مگر نثر میں (یعنی مقدمہ) کچھ لکھنا باقی تھا۔ لکھتے ہیں کہ :-

"جب تک مقدمہ ختم نہ ہو جائے کسی طرح علی گڑھ کو نہیں چھوڑ سکتا، لیکن خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ پندرہ بیس روز میں انفراغ ہو جائے گا۔
علی گڑھ ۲۴ اگست ۱۸۹۳ء"

دیوان، مقدمہ، سرسیّد کی لائف :

اس کے بعد ستمبر (ص ۱۶۸) اور اکتوبر (ص ۲۳) میں مصمم ارادہ ظاہر کیا ہے کہ علی گڑھ میں رہ کر سرسیّد کی لائف لکھیں گے، لیکن علی گڑھ سے کچھ دنوں کے لیے دہلی سے ہوتے ہوئے ۱۴ اکتوبر (ص ۲۲) کو پانی پت گئے۔ وہاں نومبر تک (ص ۱۶۹) رہے۔[1] بلکہ ۱۰ دسمبر (ص ۱۷۱) تک بھی وہیں رہے۔ اس وقت تک دیوان کے سَو صفحات چھپنے باقی تھے۔[2] کھانسی اور بواسیر وغیرہ کی شدّت (ص ۱۷۱) تھی۔ اور بھی طرح طرح کی تکلیفیں تھیں۔ علی گڑھ کے ٹرسٹیوں نے لارڈ لینس ڈون (ص ۱۶۹/۲۳) کو بلایا تھا اور کانفرنس وہیں

---

[1] ۱۵ نومبر والے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ گزٹ میں منشی محمد رحمت اللہ رعد کی جنتری پر ریویو چھپا تھا۔

[2] مکتوبات دوم ص ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اور مقدمے کے چھپوانے میں کتنا اور کہاں کہاں روپیہ صرف ہوا ہے ۱۸۹۳ء میں دیوان (مع مقدمہ) کا نسخہ مطبع انصاری دہلی میں چھپا تھا اور ٹائیٹل پیج، منشی محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کانپور میں چھپا تھا۔

منعقد کرنے کا ارادہ تھا، لیکن غالباً کانفرنس اس مرتبہ بھی دہلی میں (صفحہ ۱۶۱) ہوئی
تھی۔ ۱۱ دسمبر کو مولانا پانی پت سے روانہ ہوئے اور چھپوند ہوتے ہوئے (صفحہ ۱۶۱)
دہلی گئے اور وہاں سے علی گڑھ (صفحہ ۱۶۲) آ گئے۔

۱۸۹۳ء میں دیوان اور مقدمہ کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے اور بہت
لاگت آئی، لیکن چھپ چکنے کے باوجود ۳ فروری ۱۸۹۴ء تک انھیں یہ کتاب
مطبع نامی کانپور سے نہیں پہنچی (صفحہ ۲۶)۔ ۱۴ جون ۱۸۹۳ء کے خط میں (صفحہ ۷)
یہ رباعی نقل کی ہے جو ظاہر ہے کہ اس وقت تک لکھی جا چکی ہوگی۔

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

مولانا حالی کی عمر اس وقت ۵۶ سال کی ہو چکی تھی پھر بھی وہ عزم اور ارادے
کی تبلیغ کر رہے تھے اور زندگی کو بہت غنیمت سمجھ رہے تھے۔ اس لیے اس عمر
میں بھی انھوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ اسی کا عکس ایک مضمون میں ملتا ہے جو
۱۸۹۳ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان یہ تھا۔
"موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے۔" اس مضمون میں پہلے صوفیہ کے
خیالات بیان کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ "دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔"
لیکن اس نظریے سے زندگی اور دنیا کے تمام کام بند ہو جائیں گے۔ پھر حکما کے
خیالات پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ "اچھے کاموں سے جن کی تحریک کے
لیے موت کا کھٹکا لگایا گیا ہے صرف حقوقِ الٰہی ہی مراد نہیں ہیں بلکہ حقوقِ عباد
ان سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں۔" اور خلاصہ اس طرح کیا ہے کہ "موت کا کھٹکا

اس لیے لگایا گیا ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت اپنے اپنے فرائض مستعدی اور سرگرمی سے سرانجام دینے میں مصروف رہے۔" ایک رباعی بھی مضمون کے آخر میں ہے جو اس زمانے کی یادگار ہے :-

دم لینے کی فرصت کوئی کب پاتا ہے　　آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے

جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ　　علتی کا پیام وہ چلا آتا ہے

اس عمر میں مقدمہ بھی مرتب کر کے شائع کیا جس کے لیے وہ ۱۸۸۲ء سے ارادہ کر رہے تھے۔ (ہم اوپر ۱۸۸۲ء کے ذیل میں) دیکھ چکے ہیں کہ اس مقدمے کے لیے انھوں نے لندن کے عربی رسالہ "نخلہ" اور سیوطی کی "المزہر"[۱] کی تلاش تھی۔ ابنِ رشیق کی کتاب العمدہ اور ابنِ خلدون کے ساتھ ہی عربی ادب اور عربی ادب کی تاریخ اور اسی طرح فارسی ادب کی تاریخ پر بھی نظر رکھتے تھے بلکہ ان پر کچھ نہ کچھ لکھ بھی چکے تھے۔ ترجموں کے ذریعہ انھوں نے یورپ کے اصولِ تنقید بھی دریافت کیے تھے۔ یونانی، لاطینی اور انگریزی کے فنِ شعر و تنقید سے بھی بالواسطہ آگاہ ہو چکے تھے ۶۲ سال کی عمر ہو چکی تھی۔ خیالات اور قلم میں بھی بڑی پختہ کاری پیدا ہو چکی تھی۔ کوہ ناہن پر جانے سے طبیعت بھی بہت اچھی ہو چکی تھی۔ اس لیے وہیں مئی جون ۱۸۹۲ء میں مقدمہ شروع کیا اور دوسرے ماخذوں کی مدد سے غالباً ستمبر

---

[۱] المزہر کے انچاسویں باب (جلد ثانی) میں معرفۃ الشعراء و الشعراء پر بحث ہے لیکن وہ خود زیادہ تر ابنِ رشیق کی کتاب العمدہ سے ماخوذ ہے۔ اس نے باوجود اشتیاق کے حالی نے المزہر سے استفادہ نہیں کیا۔ اور وہ العمدہ کی طرف رجوع ہوئے . . . جس کے حوالے جگہ جگہ مقدمہ شعر و شاعری میں موجود ہیں۔ اسی طرح ابنِ خلدون کے حوالے بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ ابنِ رشیق پر محمد یوسف صاحب کا مضمون اورنٹیل کالج میگزین بابت فروری ۱۹۵۴ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸۹۳ء میں علی گڑھ میں اسے مکمل کر لیا[1]۔ ایسے ماحول اور ایسے حالات میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ تنقید کا مذاق پیدا کرنے کے لیے اس دور میں بھی تمام تنقیدی کتابوں سے بہتر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حالی پر اعتراضات یا اضافے کیے ہیں انھوں نے بھی موجودہ زمانے کے ذرائع معلومات کے باوجود، اپنی وسعتِ نظری کا کوئی ثبوت اپنی کتابوں میں پیش نہیں کیا اور ان کی کتابیں باوجود ضخامت کے بہت زیادہ تشنہ ہیں بلکہ حالی سے بالواسطہ استفادہ کرنے کی غمازی کر رہی ہیں۔

اس مقدمے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف اور اس کے خصائص پر بحث[2] ہے اور دوسرے حصے میں اردو شاعری اور شاعروں کا جائزہ ہے۔ شعر کی مدح، ذم اور تاثر کے سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش کی ہیں کہ اگر ایک چیز بری بھی ہو تو اس سے گراں بہا فائدے بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔ سیاسی معاملات میں بھی شعر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی ذیل میں سوفکلیز، شیکسپیئر، ملٹن، بائرن اور والٹر سکوٹ کے علاوہ ویلز اور فرانس کے متعدد شعرا کی خدمات کا ذکر بھی ہے کہ ان کی شاعری نے کس طرح اثر کیا اور مختلف قوموں میں کیا کیا جذبات پیدا کیے۔ مشرق میں اعشیٰ، کبشہ بنت معدیکرب، رودکی اور عمر خیام وغیرہ کے کلام سے جو اثرات رونما ہوئے تھے ان کا مختصر ذکر ہے۔ عمر خیام کی رباعی تو اب بھی دل

---

[1] ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۳ء کے خط میں (مکتوبات - دوم - صفحہ ۲۲) میں مولانا کا ایک شعر ملتا ہے جس کی غزل اس زمانے تک لکھی جا چکی ہوگی۔

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں　　　ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

---

[2] ۱۸۸۶ء کے اوائل میں حالی نے حیات سعدی لکھی تھی۔ اس کے خاتمے میں بھی اچھے شعر کی خصوصیت پر بحث ہے۔

کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے :-

شیخے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی | کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم | تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟[1]

یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ یہ رباعی عمر خیام کی ہے یا نہیں تاہم اس کلام کی تاثیر میں کوئی کلام نہیں ہے۔

آگے چل کر مولانا حالیؔ نے غالباً لندن کے اخبار "نخلہ" سے یہ خیال لیا ہے کہ "شاعری کی نسبت جو رائیں زمانۂ حال کے اکثر محققوں نے قائم کی ہیں ان کا جھکاؤ اس طرف پایا جاتا ہے کہ سویلیزیشن کا اثر شعر پر بُرا ہوتا ہے۔ جس قدر کہ علم زیادہ محقق ہو جاتا ہے اسی قدر تخیل جس پر شاعری کی بنیاد ہے گھٹتا جاتا ہے اور گریہ اور کی عادت جو ترقیِ علم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ شعر کے حق میں "سمّ قاتل ہے۔" اس خیال کے باوجود مولانا حالیؔ کا یہ خیال بھی ہے کہ شاعری شائستگی میں قائم رہ سکتی ہے کیونکہ انسان کے جذبات ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں۔ اخلاق سے بھی شاعری کا تعلق گہرا ہوتا ہے اور گو کہ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ شاعری، سوسائٹی کی تابع ہے جیسا کہ شفائیؔ اور عبید زاکانی کی شاعری سے ثابت ہوتا ہے لیکن یہی شاعری اس سوسائٹی پر بھی اچھا اثر ڈال سکتی ہے۔ پھر مولانا حالیؔ نے صاحب ابن عباد (م ۳۸۵ھ) کی ایک

---

[1] پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے خیام کی رباعیات کی تعیین کے سلسلے میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس بڑودہ میں اور پھر اورینٹل کالج میگزین لاہور (اگست ۱۹۲۱ء) میں جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ رباعی کا اطلاق چھٹی صدی ہجری کے آخر نصف سے ہوا جبکہ تیسرے مصرع سے قافیہ ترک ہوا۔

حکایت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "چوتھی صدی ہجری میں ہماری شاعری محض ایک ذریعہ سلاطین و امراء کے تقرب کا سمجھی جاتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ، شعر کی ذاتیات میں داخل ہو گیا تھا۔" اس قول میں پہلا نتیجہ بے شک صحیح ہے کہ ہماری شاعری چوتھی صدی ہجری میں سلاطین و امراء کے تقرب کا ذریعہ بن چکی تھی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اسی زمانے میں شعر کی ذاتیات میں جھوٹ اور مبالغہ داخل ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں بھی جھوٹ اور مبالغے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور اس خصوصیت کو حسنِ شعر سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اسی لیے قرآن پاک میں اَلشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ کہا گیا ہے۔

مولانا حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان شعراء تمام دنیا کے شاعروں میں سب سے زیادہ تعداد میں ہیں اور اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مدح و ستائش ممدوح کی طرف سے صلہ و انعام کا رواج جس کی وجہ سے ہر موزوں طبع کو، عام اس سے کہ وہ شاعر بننے کے لائق ہو یا نہ ہو، شاعری اختیار کرنے کا خیال ہوتا تھا۔ دوسرے ہر درجے کے شعر پر سامعین کی طرف سے بے جا تحسین و آفرین کا دستور۔ مولانا حالی کے بیان کردہ اسباب میں حقیقت ضرور ہے لیکن وہ قطعی نہیں ہیں۔ کیونکہ عرب میں اسلامی اور جاہلی شعرا کی جو قدر اور کثرت تھی اس کے اسباب صرف یہی نہیں تھے بلکہ اچھا شاعر جیسا کہ خود مولانا لکھتے ہیں "عربوں کے نسب اور زبان کی حفاظت کرنے والا اور ان کے کارہائے نمایاں اخلاف، و اعقاب تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔" پھر عرب شعرا میں سے اعشیٰ (شاعر جاہلی)، مروان بن ابی حفصہ، ریاشی، ابن قلاج اندلسی (م ۳۰۱ھ) ابن رشیق، اسامہ بن حزان نہشلی ابن یحییٰ، متمم بن نویرہ، اتیمی (م ۲۱۶ھ) زہیر بن

ابی سُلمیٰ، سلامہ بن جندل، ابونواس، کُثیر، فرزدق (م ۱۱۰ھ) جُمحی، کُمیت بن زید (م ۱۲۶ھ) جریر (م ۱۱۰ھ) وغیرہ کے شاعرانہ کمالات اور ان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ فارسی شعرا میں سے خاص طور پر فردوسی، سوزنی، حافظ، سعدی، خاقانی، فیضی، عرفی، صائب وغیرہ کا ذکر ہے اور مغربی شعرا میں سے مذکورہ بالا گولڈسمتھ، ہومر، ڈانٹے، ورجل، سفوکلیز اور پنڈار وغیرہ کا تذکرہ بھی آتا ہے اور اردو شعرا میں سے تو غالباً کسی کو نہیں چھوڑا۔ پھر غزل قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ مختلف اصنافِ سخن کی عام خامیوں پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان اصناف میں کیونکر حقیقت، وسعت اور جدّت پیدا کی جا سکتی ہے۔ غلط الفاظ کا رواج، مختلف الفاظ کی اصل اور تنقید کے نظریات وغیرہ بھی بیان کیے ہیں اور اپنی وسعتِ معلومات کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے مشورے بھی دیے ہیں کہ ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں میں کیونکر بیان کیا جائے۔ غزل کی زبان کیسی ہو، صنائع و بدائع کس حد تک مفید ہیں، سنگلاخ زمینوں سے کیا نقصانات ہیں اور اصنافِ سخن میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے۔ مولانا نے لسانیات پر بھی بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سنسکرت کے بکثرت الفاظ مثلاً گرہ، گھٹ، اجل، اردھ، اندھکار، اکھی وغیرہ اپنی شکلیں بدل کر اردو میں آتے ہیں۔ پراکرت اور بھاشا کے بھی بے شمار الفاظ اسی طرح سے اردو میں رائج ہیں۔ خود عربی کے متعدد الفاظ اپنا اصلی رنگ روپ چھوڑ کر اردو کے بھیس میں نظر آتے ہیں مثلاً غشی (غش)، مسلم (مسلمان)، محفہ (محافہ)، غلط (غلطی)، زیادت (زیادتی)، سلامت (سلامتی) اُمّ غیلاں (مغیلاں)، محابات و مدارات (محابا و مدارا)، وغیرہ دراصل عربی تھے اور قوسین والی شکلوں میں اردو

میں رائج ہیں۔ بلکہ عربی الفاظ ایران اور یورپ میں بھی وہاں کے استعمال کے مطابق بدل گئے جیسا کہ زندہ زبانوں میں ہوا کرتا ہے۔

مولانا حالی نے ایسے الفاظ کی فہرست بھی دی ہے اور ان کی اصل کی نشان دہی بھی کی ہے پھر متروکات پر بحث ہے اور یہ بتایا ہے کہ دہلی کے بکثرت ایسے الفاظ جو لکھنؤ میں متروک ہیں روزمرہ کی بول چال کی وجہ سے قائم رکھنے کے قابل ہیں اور زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائیں گے اور اگر بولے نہ جائیں تو تحریروں میں ضرور مستعمل رہیں گے۔ بہرحال مقدمۂ شعر و شاعری کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے اور مولانا حالی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

۱۸۹۴ء

اب عرصے سے مولانا علی گڑھ[1] میں رہتے تھے۔ ۷ مارچ ۱۸۹۴ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص۱۷۵) لکھتے ہیں کہ:

"میاں عنایت اللہ، تہذیب الاخلاق کو ایڈٹ کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں اور ہمارے ہی بنگلے میں رہتے ہیں اور ساتھ ہی کھانا کھاتے ہیں میں نے ایک مہینے سے کچھ کام نہیں کیا۔ تہذیب الاخلاق کے لیے کچھ اسٹڈی کرتا ہوں۔ ارادہ ہے کہ پانچ سات مضمون ایک ہی دفعہ لکھ کر پھر اطمینان

[1] جنوری ۱۸۹۴ء میں مولانا شبلی کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا تو مولانا حالی نے تیرہ شعر کا عربی قطعہ لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

یا وحیداً من الکرام فریداً   وعزیزاً کمثلِ علقٍ نفیسٍ

سے سرسید کی لائف لکھنی شروع کردں۔ مگر حق یہ ہے کہ اب کچھ کام ہم
سے ہو نہیں سکتا۔"

تین مضامین :

اِن "پانچ سات" مضامین کے بجائے صرف تین مضمون ہم کو اس رسالے میں شائع شدہ ملتے ہیں جو مقالاتِ حالی حصہ اوّل میں موجود ہیں۔ ایک مضمون "دنیا کی کُل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟" یکم شوال ۱۳۱۱ھ (مطابق ۷ر اپریل ۱۸۹۴ء) کے نمبر میں، دوسرا مضمون "ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟" یکم ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۵ر جون ۱۸۹۴ء) کے شمارے میں اور تیسرا مضمون "حسب و نسب" یکم محرم ۱۳۱۲ھ (۵ر جولائی ۱۸۹۴ء) کے پرچے میں شائع ہوا۔ پہلا مضمون جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے عمل کے حق میں ہے اور مولانا نے مختلف مثالوں سے عمل کے لیے ترغیب دلائی ہے۔ مطالب کچھ اس طرح آئے ہیں کہ اقبالؔ کے اس شعر کے مترادف ہیں :-

جیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسّس   جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ

خلاصہ یہ ہے کہ :-

"جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے، نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔"

یہی جذبہ دوسرے مضمون "ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟" میں کارفرما ہے۔ اس میں

بتایا ہے (جیسا کہ مقدمۂ شعر و شاعری کے آخر میں بھی ہے) کہ ترقی کے لیے سب سے پہلے اپنے تنزل کا یقین اور احساس ضروری ہے تاکہ ہم ہاتھ پاؤں مار سکیں اور مسلسل کوشش کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ امن اور آزادی ہماری ترقی کے لیے معاون ہیں اور "امن و آزادی ہماری جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی"۔ پھر انگریزی تعلیم والے لوگوں کا حال ہے جو بی۔ اے، ایم۔ اے کرنے کے بعد سفارشوں کے لیے سرگرداں رہتے ہیں اور بہت سے نوکری بھی نہیں کرچاہتے وہ دنیا بھر کی تاریخ پڑھتے ہیں، لیکن اپنی ہستی کی خبر نہیں رکھتے" وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمّے ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کے، ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمّے ہیں اُن پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا" پھر ولایت سے واپس آنے والے طلبہ کا حال بیان کیا ہے جو "اپنی عمر کا ایک عمدہ حصّہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حبِّ وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین وایمان سمجھتی ہے لیکن خود یہ طلبہ انہی دونوں خوبیوں سے کوسوں دُور ہیں۔ بہر حال ترقی کے لیے پرانے اور نئے خیال والے دونوں سعی و کوشش نہیں کرتے۔ اس وبائے عام کا سبب تک

لہ غالباً اِسی سال وہ مضمون بھی لکھا ہو گا جس میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کو نصیحت کی ہے کہ وہ معاش بھی حاصل کریں اور ایک خاص مقصد کے مطابق تیاری کریں۔ یہ مضمون مقالاتِ حالی حصہ دوم میں نمبرہ ہے۔

کہ نہایت زبردست تدبیروں سے تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔" ان "تدبیروں[1]" کو سمجھانے کے لیے وعدہ کیا ہے اور مضمون ختم کر دیا ہے۔

تیسرا مضمون "حسب اور نسب" پر ہے۔ جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ حسب کو نسب پر ترجیح دی ہے اور ابن خلدون کے یہاں سے ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ پھر اس پر محاکمہ بھی ہے کیونکہ "اضافی خوبیوں کو ہمارے مقتداؤں نے ہمیشہ حقیر دنا چیز سمجھا ہے اور انسان کا کمال محض اس کی کسبی اور ذاتی خوبیوں پر منحصر رکھا ہے۔" آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت و آبرو سے دنیا میں زندگی بسر کرے، اس کے واسطے جائداد خرید کر چھوڑ جاتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے بلکہ بد چلنی میں بھی شہرۂ آفاق ہو۔ جہل اور جوانی اور اس کے ساتھ بے فکری، جہاں یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں، پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔"

ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں بعض مصلحین قوم نے ایک انجمن "ندوۃ العلماء" قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ نصاب عربی کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو زمانے کے مطالبات کے مطابق بنایا جائے

---

[1] انہی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے اسی سال "ندوۃ العلماء" کا قیام ہوا جس میں مولانا حالی نے اپنی رائے پیش کی تھی اور علی قوت کے ختم ہونے کے اسباب پر جو مضمون ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں۔ علمائے ہند کے اختلاف دور کئے جائیں اور ایک ایسا دار العلوم قائم کیا جائے جہاں صنعت و حرفت اور فنون جدیدہ بھی سکھائے جائیں۔ اس انجمن کا اجلاس ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل کو کانپور میں ہوا۔ مولانا[1] حالی نے اپنی تقریر وہاں بھیج دی تھی۔ اس میں انہوں نے مروجہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کی سفارش کی ہے۔ تاکہ بڑے بڑے اہل قلم کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ اور نظر سے گذرتی رہیں، پڑھانے والے بھی صرف پرانی کتابوں کو پڑھاتے پڑھاتے اکتا نہ جائیں بلکہ نئی کتابوں میں بھی دلچسپی لے سکیں اور ان کے علم و فضل کو ترقی ہو سکے پھر طریقہ تعلیم کی خامیاں بتائی ہیں کہ طلبہ عربی پڑھتے ہیں، لیکن عربی تحریر تقریر سے بالکل عاجز ہوتے ہیں۔ ترجمے کی مشق بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس وقت تک قرآن پاک کے ترجمے بہت کم تھے۔ عربی ادب کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ تاکہ قرآن اور حدیث کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ عربی کے ساتھ فارسی بھی باقاعدہ سکھائی جائے تاکہ اس سے اردو زبان کی تکمیل میں مدد ملے اور فارسی اس لئے بھی ضروری ہے کہ "وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بزرگوں کی نشانی ہے" تاریخ۔ جغرافیہ اور حساب کی باقاعدہ تعلیم کے لئے بھی مشورہ دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ:

---

[1] سرسید نے بھی اس انجمن کو سراہا تھا جیسا اُن کے اس خط (معارف نمبر ۱۔ جلد ۴ صفحہ ۷۳) سے ظاہر ہوتا ہے

جناب مولانا مخدوم و مکرم من مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ آپ کا نوازش نامہ اور حصہ اول روداد ندوۃ العلماء پہنچا ممنون عنایت ہوا۔ اس پر ریویو لکھنا اور فرائض ریویو نویسی کو پورا پورا ادا کرنا کسی قدر مشکل اور نامناسب ہے۔ ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے۔ اسکو چلنے دینا چاہئے۔ خدا اسکا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اسکی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کانفرنس کے اجلاس ایک ریزولیشن پیش کریں گے کہ تمام مسلمانوں کو ندوۃ العلماء کی تائید کرنی چاہئے۔ غالباً سب لوگ اس سے اتفاق کریں گے۔ اور جو آپ کا ارشاد ہے اس پیرایہ میں اسکی تعمیل ہو جائیگی۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں ہے کہ باہم علماء کے اتفاق ہو، الا کوشش ضرور ہو

السلام علیکم۔ خاکسار سید احمد، علی گڈھ

۲۱ ردسمبر ۱۸۹۴ء

"ہمارے علم و ادب میں، حدیث میں، قرآن میں ہزاروں نام امصار و قریٰ و اماکن و مواضع کے آتے ہیں، مگر طالب علموں کو سوا اس کے کہ کسی شہر یا مقام کا نام ہے۔ ان کی نسبت اور کچھ نہیں بتایا جاتا" اسی سلسلے میں ہیئت جدید کو پڑھنے اور سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور اس زمانے کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ اس علم کے پڑھنے سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ لکھتے ہیں کہ "جو لوگ دین اسلام کو دینِ برحق اور خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں ان کا یہ اعتقاد ہونا چاہئے کہ اگر ہیئت جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصولِ اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتی اور اگر وہ اصولِ اسلام کے خلاف ہے تو یقیناً جھوٹی ..... لیکن اس بات کے دریافت کرنے کے لئے کہ وہ غلط ہے یا صحیح، یا اصولِ اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، ضرور ہے کہ اوّل اس کا علم حاصل کیا جائے"

یہ سب باتیں مولانا نے مشورے کے طور پر لکھ بھیجی تھیں، اور تجربہ کہتا ہے کہ ندوہ نے بہت کچھ ان پر عمل کیا۔[1]

مولانا حالی پہلی رمضان ۱۳۱۱ھ (۸ مارچ ۱۸۹۴ء) سے پھر بیمار ہو گئے تھے عید کی شام کو (۷ اپریل) دہلی پہنچے۔ وہاں سے ۱۲ اپریل کو پانی پت گئے (مکتوبات حصہ دوم ص ۱۷۶-۱۷۷) اور ۹ مئی کو پھر علی گڑھ واپس آ گئے۔

---

[1] شاید مولانا سلیمان ندوی کی "ارض القرآن" کی تحریک یہیں سے ہوئی ہو گی، لیکن پہلے ندوہ کا کام بہت سست تھا۔ مولانا حالی نے مکتوبات (حصہ اول ص۱) میں ۱۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو لکھا ہے کہ گذشتہ پانچ برس میں اگر کوئی کام ندوۃ العلما نے کیا ہے تو علمائے سلف (از نواب صدر یار جنگ) کا لکھوانا ہے اور بس" لیکن بعد میں اس کے رسالہ الندوہ (بابت ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ۔ جون ۱۹۰۵ء) میں علم حدیث پر مولانا سلیمان ندوی مرحوم کے مضمون کو سراہتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے فبارك الله فيهما وفي طلبتهما وفي تعليمها۔ مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی پیدا نہیں کر سکی"

سرسید مع رفقاء ۱۴ر اپریل ۱۸۹۴ء کو پانی پت سے گذرتے ہوئے پنجاب کے سفر کو روانہ ہوئے۔ اپنی صاحبزادی کی علالت سے انھیں بہت تشویش تھی اور بہت سے خطوط میں اس کا ذکر ہے۔ ۲۰ر جون والے خط میں بھی (صفہ ۱۸۰) لکھتے ہیں کہ "میں ایک مہینے سے سید صاحب کی لائف لکھنے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مصروف تھا۔ مگر اب تین چار دن سے جب سے یہ اطلاع (صاحبزادی کی بیماری کی) پہنچی ہے مطلق کام نہیں ہوتا۔"

حیاتِ جاوید کی ابتدا:

چنانچہ ۲۲ر جون کو پانی پت جانا پڑا اور وہاں سے مریضہ کو دیکھ کر ۲۲ جولائی کو علی گڑھ (صفہ ۱۸۱) واپس ہوئے۔ غرضکہ مئی ۱۸۹۴ء سے سرسید کی لائف لکھنی[1] شروع کر دی تھی، لیکن مریضہ کی وجہ سے پھر بھی تشویش تھی۔ دماغ کو سخت صدمہ پہنچا تھا (صفہ ۱۸۵) طبیعت خراب تھی۔ مریضہ کی حالت سے خود بھی[2] پانڈیفن بن گئے تھے، پھر ۱۴ر نومبر کے خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ارادہ ہے کہ اسٹریچی ہال کے افتتاح کے بعد ۱۳ یا ۱۴ر نومبر تک پانی پت پہنچ جاؤں۔"

چنانچہ ۱۷ر نومبر تک (صفہ ۱۸۲) وہ علی گڑھ سے دلّی اور وہاں سے ۲۲ر نومبر ۱۸۹۴ء تک پانی پت پہنچ گئے ہوں گے۔ وہاں کھانسی اور زکام میں مبتلا ہو گئے (صفہ ۱۸۶-۱۸۹) اس لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

---

[1] صفہ ۱۹۶ میں لائف لکھنے کی دقتوں کا ذکر ہے۔ [2] مکتوبات (دوم، صفحہ ۱۸۳) میں اس مضمون کا ذکر ہے جو سرسید کے متعلق عربی میں لکھا تھا۔ یہ مکتوب ۲۰ر دسمبر ۱۸۹۴ء کا ہے۔

سنہ ۱۸۹۵ء

پانی پت سے ۲۶ فروری ۱۸۹۵ء کے خط میں (ص ۲۹) لکھتے ہیں کہ:-

"سرسید اور نواب محسن الملک اور مولانا شبلی و حاجی اسمٰعیل خاں بتقریب جلسۂ سالانہ انجمن حمایتِ اسلام لاہور جانے والے تھے۔ کرنال میں بھی ان کے ٹھہرانے کی ایک سبیل نکل آئی۔ اس وجہ سے یہ خیال ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو چندہ کی فراہمی میں کوشش کی جائے۔ . . . خدا کا شکر ہے کہ وہ ۲۰ فروری کو کرنال پہنچے اور ۲۲ کی صبح کو مع الخیر لاہور پہنچے (لیکن وہاں بیمار ہو گئے اور جلسے میں بھی شریک نہ ہو سکے ص ۱۹۳) اور کل ۵ ۲ کی صبح کی گاڑی میں پانی پت ہوتے ہوئے واپس علی گڑھ کو روانہ ہو گئے۔ . . . . .

سید صاحب انتیس سو روپے اپنے ساتھ لے گئے۔"

مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی:

۱۸۹۵ء میں مولانا پریشان رہے۔ پھر بھی کچھ وقت نکال کر ایک مضمون "مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی" لکھا جو (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) میگزین علی گڑھ (بابت جولائی ۱۸۹۵ء) میں شائع ہوا۔ یہ مضمون انہی مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو حالی نے ۱۸۹۴ء میں لکھے تھے اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس مضمون کے شروع میں مولانا حالی نے پنجاب کے کسی انگریز افسر کا ایک بیان نقل کیا ہے جو اس نے مسلمانوں کے متعلق پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ میں دیا تھا۔ وہ بیان اب بھی

ہمارے دلوں کو ہلا دیتا ہے۔ وہ یوں ہے :-

"پنجاب کے رہنے والوں پر مذہب اسلام کا اختیار کر لینا نہایت بُرا اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ ان کو مغرور اور مشیخت مآب بنا دیتا ہے۔ ان کی طبیعت کو حق حلال اور ریاض کا لقمہ حاصل کرنے سے پھیر دیتا ہے۔ کیونکہ سستی اور کاہلی اور بناوٹ خاص اوصاف ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تمیز ہوتی ہے۔"

اس بیان میں تعصب ضرور ہے، لیکن ہم مسلمانوں کی جو عام حالت بتائی گئی ہے وہ صحیح بھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلام نے یہ خرابیاں پیدا کیں مولانا حالی نے تاریخ کی مختلف مثالوں سے اپنی قوتِ استدلال سے ثابت کیا ہے کہ شخصی حکومتوں کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ایشیائی قوموں میں کاہلی اور سُستی ورثے میں آئی ہے، کیونکہ رعیت کے لوگ نہ تو ملکی معاملات میں دم مار سکتے ہیں نہ مذہبی امور میں کوئی بات خلافِ جمہور زبان پر لا سکتے ہیں اور نہ قوم کی معاشرتی خرابیوں کو دُور کر سکتے ہیں۔ یعنی ان کے قوائے عملیہ بالکل معطل ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے اگر ہم اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کریں اور شخصی حکومت یا قومی سلطنت کے سہارے نے جو ہمارے قوائے عملیہ کو مُردہ کر دیا ہے ان کو سر سید جیسے مسیحائے قوم پھر زندہ کر سکتے ہیں۔

مضمون کا خاتمہ ان اشعار پر کیا ہے جو ہماری حالت کے آئینہ دار ہیں :-

یاراں بکوئے عشق گزارے نمی کنید　　اسباب جملہ حاضر و کارے نمی کنید
چوگانِ کام در کف و گوئے نمی زنید　　بازی چنیں بدست و شکارے نمی کنید

ترسم کز یں چمن نبر یدا ستینِ گُل   کز گلبنش تحمّلِ خارے ہمی کنید

مولانا حالی نومبر ۱۸۹۴ء میں پانی پت گئے تھے اور وہیں اپنی پریشانیوں کی وجہ سے ٹھہرے رہے - ۲۹ ستمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں (ص۳۵) لکھتے ہیں کہ :-

مُستقلِ علالت کا سِلسلہ :

"اب کچھ نہ کچھ شکایت ہمیشہ رہنے لگی ہے۔ نت نئی تکلیفیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دائمی اور استمراری ہوتی جاتی ہیں۔ ڈاڑھ اور دانتوں کا درد برس روز سے برابر رہتا ہے۔ ایک دانت اکھڑوا چکا ہوں۔ ایک ڈاڑھ اور اکھڑوانی پڑے گی، ورنہ تکلیف رفع نہیں ہونے کی۔ سب سے زیادہ تکلیف تو اس ڈاڑھ کی ہے جو ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے سے کھانسی کی بھی شدّت ہو گئی ہے۔ بواسیر بھی زور پکڑ جاتی ہے .... سب سے زیادہ اس بات کا خیال ہے کہ سیّد صاحب کی لائف لکھنی شروع کر دی تھی مگر طبیعت کا رنگ دیکھتا ہوں تو اس کا ختم کرنا ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔"

شامِ بہاری لال :

اس کے بعد اُوپر کی ڈاڑھ جو بہت تکلیف دیتی تھی وہ اکھڑوا ڈالی (ص۲۰۴) لیکن کوئی آرام نہیں ہوا بلکہ خون زیادہ بہ جانے سے ضعفِ دماغ بڑھ گیا۔ فرزند علی (نواسہ) علی گڑھ میں سخت بیمار تھے اس لیے وہاں ۸ نومبر ۱۸۹۵ء کو جانا پڑا اور

طویل علالت کے بعد صحت سے (صفحہ ۲) بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ڈاڑھ میں اور سر میں سخت درد تھا اس لیے دسمبر کے دوسرے ہفتے میں (صفحہ ۲۱) کرنال علاج کے لیے چلے گئے اور دسمبر کے آخر ہفتے میں یا شروع جنوری ۱۸۹۶ء میں وہاں سے پانی پت آ گئے۔ ۶ جنوری ۱۸۹۶ء والے خط میں جو پانی پت سے لکھا تھا (صفحہ ۲۱۶) شام بہاری لال کے متعلق خبر ہے کہ علی گڑھ سے خط آیا ہے کہ وہ جیل خانے میں مر گیا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جو سر سید کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا اور اس نے کالج کے ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپے (۱۰۵۴۰۹) غبن کیے تھے اس کا حال تفصیل سے حیاتِ جاوید میں موجود ہے۔

۱۸۹۷ء [۱]

نومبر ۱۸۹۴ء سے شروع دسمبر ۱۸۹۷ء تک مولانا حالی پانی پت ہی میں رہے

---

[۱] ۱۸۹۶ء کے کالج میگزین میں مولانا کا ایک مضمون "تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر" شائع ہوا تھا جو مقالاتِ حالی حصۂ اول میں ہے۔ درستی اخلاق، عقل سلیم، جرأت، کفایت شعاری، راست بازی، خوش معاملگی، دلیری اور تجارت کے فوائد و برکات پر یہ مضمون مشتمل ہے۔ ۱۸۹۶ء میں مولانا نے اپنے ایک مشہور استاد حضرت قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کے انتقال پر ان کے حالات سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ "نقوش" (لاہور) فروری، مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اب قاری صاحب مرحوم کے مزار پر سادھوؤں کا قبضہ ہے اور اس کے احاطہ میں مرگھٹ بن گیا ہے۔ سید علی اثر کانپوری نے قاری صاحب کے انتقال پر جو قطعہ لکھا تھا اس کے آخری شعر یہ ہیں:۔

اثر جستیم چوں سالِ وصالش — ندا زد ملہمِ غیبی بدیں سان

کنوں تاریخ از روئے جمل گو — بحق پیوست ایں قاری قرآن

یہ قطعہ راقم الحروف کو ریاست ریواں میں حکیم رحمٰن علی کی ایک بیاض سے ۱۹۴۲ء میں حاصل ہوا تھا۔

(۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء)

یا کبھی چند روز کے لیے پھپھوند (ص ۲۳٦) چلے گئے اور مختلف ذاتی، خانگی اور خاندانی پریشانیوں میں اُلجھے رہے۔ علی گڑھ سے ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو لکھتے ہیں کہ (جلد اول ص ۲۵):-

"میں پونے تین مہینے سے علی گڑھ میں ہوں۔ شاید شوال (یعنی ۲۳ فروری کو عید) میں پانی پت چلا جاؤں بلکہ یہاں کی آب و ہوا مجھے بہت موافق ہے"

یادگارِ غالبؔ کی ابتداء:

گویا اس زمانے میں انھوں نے حیاتِ جاوید کے لیے وقت نکال لیا، لیکن اس سے قبل غالباً پانی پت کے قیام میں اپنی الجھنوں کے باوجود یادگارِ غالب مرتب کی جو ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور سے نہایت پاکیزہ خط کے ۲۸۰ صفحات پر شائع ہوئی۔ اسی ایڈیشن کے صفحہ ۳ میں مولانا فرماتے ہیں:-

"باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام (حیاتِ جاوید کی ترتیب) میں مصروف تھا، دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں ان کو اب زیادہ حالتِ منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں"۔

چونکہ اس زمانے میں حیاتِ جاوید کی ترتیب پر توجہ زیادہ تھی اس لئے یادگارِ غالب میں آگے چل کر (صفحہ ۲٦۱) غالب کے ایک فارسی شعر کی تشریح کے سلسلے میں فرماتے ہیں:-

"۔ ۔ ۔ ۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلمانی پر اکتفا کر۔ یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں حسنِ اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے جس کی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جس نے کافر، ملحد، نیچری، دجّال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہ ہوا۔"

یادگارِ غالب کی تحریر کا مقصد بھی حالی نے (صفحہ ۴) بیان کر دیا ہے کہ:۔

"اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایے میں کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حُبِ اہلِ بیتؑ کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیئے۔"

یعنی حالی کی اس کتاب میں یہی چار باتیں شرح و بسط کے ساتھ موجود ہیں اور انہی کو وہ سوانح نگاری کے لئے اس موقع پر کافی سمجھتے تھے۔ اسی مقدمے کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ مرزا کی لائف ۔ ۔ ۔ ۔ ان فائدوں سے خالی نہیں ہے،

جو ایک بایوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں، لیکن اگر ان
فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا
بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی
کے سوا کچھ نہ ہو، ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے
لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔"

یعنی غالب کی سوانح نگاری سے ایک فائدہ یہ بھی متصور تھا کہ اُس وقت کی قومی پژمردگی کو دور کیا جائے۔ یہی مقصد حیاتِ سعدی لکھتے وقت بھی پیش نظر تھا جیسا کہ اس کے دیباچے کے ایک اقتباس میں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔

-مولانا عبدالحق صاحب نے رسالہ اردو (اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں ایک تبصرے کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ "مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا (غالباً ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے) مولانا حالی، یونین کے پاس جو بنگلہ ہے اس میں آکر مقیم ہوئے تھے۔ ایک روز شام کو جو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو گفتگو کے اثنا میں مرزا غالب پر کتاب لکھنے کا تذکرہ کیا۔ میں نے کہا کہ ضرور لکھنی چاہیے۔ غالب بہت بڑا شخص گذرا ہے۔ یہ سن کر اپنے خاص انداز میں فرمانے لگے، ایک ہی تھا! - یادگار غالب پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ بے شک وہ ایک ہی تھا۔"

یادگارِ غالب پر تبصرہ:

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ۱۸۹۳ء میں مولانا یادگار غالب

کاڈول ڈال چکے تھے۔[1] لیکن یہ کتاب ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اسی تبصرے میں مولانا عبدالحق صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مولانا نے مرزا غالب کی سیرت کے خط و خال اس خوبی اور جامعیت کے ساتھ کھینچے ہیں کہ مرزا جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، بولتے چالتے، کھاتے پیتے ہنسی، دل لگی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے گویا ہم ان کی صحبت میں بیٹھے ان کی باتوں اور ان کے کلام کا مزہ لے رہے ہیں، اور اس سے بڑھ کر ان کے کلام کے حسن و کمال کو ایسے دلاویز طریقے سے بیان کیا ہے کہ عام و خاص دونوں پر ان کی اصلی قدر و قیمت آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ اسی کتاب کا طفیل ہے کہ اس کے بعد سے سیکڑوں مضامین بیسیوں رسالے اور شرحیں مرزا غالب کے کلام پر لکھی گئیں اور اردو دیوان کے بیسیوں طرح طرح کے ایڈیشن طبع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ چنانچہ جو ہر دلعزیزی اس وقت غالب کو حاصل ہے وہ اردو کے کسی شاعر کو نہیں۔ یہ کتاب مولانا نے اس وقت لکھی جبکہ مقدمہ شعر و شاعری اور ترتیب دیوان ختم تھی اور حیات جاوید کا ڈول ڈال چکے تھے۔"

مولانا عبدالحق صاحب کے اس مختصر لیکن جامع تبصرے کے بعد کچھ اور لکھنا فضول ہے اور حقیقت ہے کہ باوجود چند جدید رنگ کے اعتراضات کے یادگار غالب اپنی جگہ قائم اور غالب ہے اور اس کی نعم البدل تو کیا، بدل بھی اب تک کسی نے پیش نہیں کیا۔

یادگار غالب کے سلسلے میں ایک بات قابل لحاظ یہ ہے کہ حیات سعدی کے صفحات میں حالی نے اچھے شعر کیلئے جو شرائط پیش کی ہیں، اور جن کا ذکر شرح و بسط کے ساتھ شعر و شاعری

---

[1] لیکن دہلی کے قیام میں بہت سی چیزیں قلم بند کر لی تھیں گو کہ ترتیب نہیں دی تھی۔ یادگار غالب کے دیباچے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ترتیب کے متعلق مولانا عبدالحق نے چند ہم عصر (حالی) میں بھی یہی سال لکھا ہے۔

میں موجود ہے۔ وہ سمٹ کر یادگارِ غالب میں غالب کی خصوصیات کے ذیل میں آگئی ہیں۔

سرسیّد کا مرثیہ: ۱۸۹۷ء

۱۸۹۷ء کے آخر میں[1] مولانا علی گڑھ آئے اور حیاتِ جاوید کے لیے مستعدی سے کام کرنے لگے۔ فروری والے خط کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے بعد یعنی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں قوم کے زبردست محسن اور اردو نثر کے باوا آدم یعنی سرسیّد احمد خاں نے وفات پائی۔ ان کے رفقائے کار اور خصوصاً[2] مولانا حالی کے دل پر کیا گزری ہوگی وہ اس مرثیے میں دیکھیں جو محتشم کاشی کے طرز میں ہے لیکن اس سے کم بھی نہیں ہے۔

---

[1] ۱۸۹۵ء کا لکھا ہے ایک چھوٹا سا تبصرہ مقالاتِ حالی حصّہ دوم میں ملتا ہے جو اسکول کی ایک کتاب انوار الاخلاق پر لکھا تھا۔ اسی سال مولانا نے ۴۷، ۴۸ سال کے بعد رمضان (فروری و مارچ) کے پورے روزے رکھے تھے۔ (مکتوبات۔ دوم۔ صہ ۴۳)

[2] سرسیّد کے انتقال کے فوراً بعد مولانا شبلی نے ایم۔ اے۔ او کالج میگزین علی گڑھ (اپریل ۱۸۹۸ء) میں ایک مضمون "سرسیّد مرحوم اور اردو لٹریچر" شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد نے اردو انشاپردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہوسکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے۔ وہ لکھیں گے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جبکہ تمام ملک میں سرسیّد کی آواز کا ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے، میں نے اس کی تعمیل کی۔ ورنہ میں حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا۔"

عہ یہ مضمون مقالاتِ شبلی حصہ دوم میں شائع ہوچکا ہے۔

۱۰ر اپریل کے خط سے (مکتوبات دوم - صہ ۲۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کو مرثیہ صاف کر کے طباعت کے لیے بھیج دیا تھا اور ۱۲ر مئی تک وہ (صہ ۲۴۵) چھپ چکا تھا۔ یہ مرثیہ "ترکیب بند" میں ہے جس میں سات بند ہیں۔ آخری اشعار کے علاوہ ہر بند میں نو نو شعر ہیں۔ شروع اس طرح ہوتا ہے۔

آہ ازیں تیر گذارا کز کماں انداختند ——— آہ کز یک زخم قومے نیم جاں انداختند

اے عجب گز رحلتِ فردے زافرادِ بشر ——— عالمے را از قیامت در گماں انداختند

تیسرے بند میں "انسانیت" کی تعریف جن الفاظ میں مولانا حالی نے کی ہے اس سے نہ صرف سرسید بلکہ خود حالی کی "انسانیت" کا پتا چلتا ہے۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمان شدن
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس
در شبستان تنگ دل از محنتِ زنداں شدن
آتشِ قحطے کہ در کنعاں بسوزد باغ و کشت
بر فرازِ تختِ مصر از تابِ آں بریاں شدن
زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم!
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن
می تواں مقبولِ عالم گشت اما ہم چو شیخ
بہرِ سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن
جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

یہ اشعار پورے ترکیب بند کی جان ہیں اور آخری بند کا آخری شعر بھی سرسید اور حالی کے جذبات کا خلاصہ ہے :-

مزدِ او ایں بس کہ در اصلاحِ خود کوشید زود
کز شما غیر از شما مطلوبِ او چیزے نبود[۱]

اسی کے متعلق مکتوبات (دوم ص ۵۲) میں لکھتے ہیں کہ میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اوّلاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سلوک اور بھلائی کی جائے "

زبانِ گویا :

۱۸۹۸ء میں مولانا حالی کا ایک مضمون "زبانِ گویا" بھی شائع ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ پہلے لکھا ہوگا۔ یہ پورا مضمون فصاحت و بلاغت سے پُر ہے۔ اس کا پہلا پارہ یہ ہے :-

"اے میری بلبل ہزار داستان ! اے میری طوطی شیط بیان ! اے میری قاصد ! اے میری ترجمان ! اے میری وکیل ! اے میری زبان ! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے ؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزہ ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا دو نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر

---

[۱] مولانا حالی کی فارسی شاعری پر مفصل مضمون علیحدہ پیش کیا گیا ہے۔

زہر کی وار، نہ کانٹے کا نشتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کبھی اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔"

شروع سے آخر تک زبانِ گویا کے فائدے اور نقصانات اسی انداز میں بیان کیے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فصاحت و بلاغت کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

سرسید کی مذہبی خدمات:

علی گڑھ کالج میگزین (بابت ماہِ مئی ۱۸۹۰ء) میں ایک مضمون "سرسید کی مذہبی خدمات" شائع ہوا تھا جس کا ذکر ۱۱ اپریل ۱۸۹۰ء والے خط میں ہے (مکتوبات دوم۔ صفحہ ۴۰، ۴۲، اور ۴۴) کہ ماریسن صاحب کا خط پانی پت آیا ہے کہ میگزین کے لیے وہ مضمون بھیجو۔ مولانا کے اسی مکتوب میں آخری جملہ ہے کہ "مسٹر آرنلڈ کی اسپیچ اور پایونیر کا جو فقرہ پنجاب آبزور میں کوٹ کیا ہے اس کا ترجمہ کرا کے مجھے ضرور ضرور بھیج دو۔" یہ اشارہ سرسید کے متعلق ہے[1]۔ بہرحال میگزین والا مضمون بہت کچھ حیاتِ جاوید کا خلاصہ ہے۔ ابتدا اس طرح کرتے ہیں کہ "سرسید کی لائف میں منجملہ ان مختلف حیثیتوں کے جو ان کی ذات میں جمع تھیں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ ان کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے جس پر ان کی لائف

---

[1] سرسید کے مضمون "بحث و تکرار" اور ان کی وفات کے متعلق پایونیر میں جو مضمون نکلا تھا اس کا حال مکتوبات دوم صفحہ ۲۵۰ میں دیکھیں۔

میں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ہر ایک پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ہمیں صرف تین امور پر بحث کرنی منظور ہے :۔

۱۔ جو کچھ گذشتہ چالیس برس میں سرسید نے مذہب کے متعلق لکھا اس کے لکھنے کا منشا کیا تھا؟

۲۔ یہ لٹریچر مسلمانوں کی مذہبی تصنیفات میں کیا درجہ رکھتا ہے؟

۳۔ ان تصنیفات سے اسلام یا مسلمانوں کے حق میں کیا نتیجے مرتب ہوئے؟

یہ مضمون بتیس صفحات کا مقالاتِ حالی حصۂ اول میں موجود ہے اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور بلا شک وشبہ حیاتِ جاوید کا نچوڑ ہے۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ جس شخص کو وہ طول وطویل کتاب دیکھنی نہ ہو وہ یہ مضمون دیکھ لے۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی مشکلات کا جائزہ لیتے ہوئے سرسید کی خدمات بیان کی ہیں کہ ان کی تعلیم کے اثر سے قومی نفرت اور مذہبی تعصب دُور ہو گیا اور سرسید نے سیاست، ادب اور مذہب کے معاملات میں اپنے وقت میں بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ یہ مضمون دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کچھ اس انداز سے حقیقت بیان کی گئی ہے کہ سرسید کی تحریک کے مخالفین بھی ان کے قائل ہو سکتے ہیں۔

حیاتِ جاوید کی طباعت :

حیاتِ جاوید اس سال چھپنی شروع ہو گئی تھی۔ پانی پت سے ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص ۴۶) لکھتے ہیں کہ "سرسید کی لائف بہت تیزی سے

چھپ رہی ہے اور اگر میں ہمہ تن اس کے مسودہ کی تیاری میں مصروف نہ ہوں تو کام بند ہو جائے اور اس سال کے اخیر تک جو اس کے شائع کر دینے کا ارادہ ہے وہ پورا نہ ہو سکے۔" لیکن پورے ایک سال کے بعد ۲۲ اگست ۱۸۹۹ء میں لکھتے ہیں کہ ابھی تک اس کے سو صفحے چھپے ہیں۔ (مکتوبات دوم ص ۵۳) اور اس تاخیر کا سبب اپنی بیماری بتائی ہے (مکتوبات اول ص ۳۳)۔ پھر (اول ص ۳۸) وہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء کو لکھتے ہیں کہ "حیاتِ جاوید کی انڈکس بڑی مشکل سے تیار ہوئی اور کل مطبع میں بھیج دی گئی۔"

حیاتِ جاوید اور شبلی:

حیاتِ جاوید کی ترتیب میں مولانا حالی کو سخت دشواریاں پیش آئیں۔ اپنی مستقل بیماریاں جو کبھی کبھی زیادہ ستانے لگتی تھیں، اعزّہ کی اور گھر والوں کی بیماریاں اور تکلیفیں، علی گڑھ میں تنہا قیام اور وہ بھی تقریباً ساٹھ سال کے بڑھاپے میں، یہ سب ایسی دقتیں تھیں جن پر انہی جیسے پیرِ جواں ہمت قابو پا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ (مکتوبات اول۔ ص ۴۳) میں لکھتے ہیں کہ "میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔" یہ چھ سال کی مدت، متعدد وقفوں کے باوجود، حیاتِ جاوید لکھنے کے لیے کم تھی۔ لیکن یہ انہی کی ہمت تھی کہ اپنی ذاتی الجھنوں کے باوجود اتنی بڑی کتاب بڑی تحقیق و تلاش کے بعد مرتب کی۔ اس کی لمبی چوڑی فہرست ہی سے جب انسان گھبرا جاتا ہے تو ایسے ضعیف اور کمزور شخص کو مواد جمع کرنے میں کتنی الجھنیں محسوس نہ ہوئی ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سوانح نگاری میں ایسی کتاب اس سے قبل کم از کم اردو زبان میں موجود نہ تھی۔ اس کے لیے مولانا نے

ان تھک کوشش اور پیہم جستجو سے کام لیا ہے۔ لیکن نظریات مختلف ہوتے ہیں چنانچہ اگر مولانا شبلی نے اس کتاب کو پڑھ کر "مدلل مداحی" کہا تھا اور پڑھنے سے پہلے "اسے "کذب و افترا کا آئینہ" کہہ دیا تھا تو دوسری طرف مولانا عبدالحق نے بھی بغیر دیکھے ہوئے[1] (مکتوبات۔ اول۔ ص ۲۰۱) اس کی تعریف شائع کر دی تھی بات دراصل

۱۔ [میں نے رسالہ افسر کے سرورق کے آخری صفحے پر حیاتِ جاوید کی تکمیل اور عنقریب شائع ہونے کے متعلق تین چار سطر کی ایک اطلاع چھاپی تھی۔ اس میں یہ الفاظ بھی تھے کہ اس وقت یہ مولانا کی آخری تصنیف ہے جو ان کی مہا تصنیف ہو گی۔ صرف "مہا تصنیف" کا ایک لفظ (جس کی مولوی وحید الدین سلیم نے بہت داد دی تھی) ایسا تھا جسے تعریف پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے مولانا کے کلام اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اُسے ایسا کہنے کا حق حاصل ہے۔ مولانا کی کسرِ نفسی کی انتہا ہے کہ اسے بھی اپنی تعریف سمجھے۔ علاوہ اس کے میں اس کتاب سے بالکل ناواقف بھی نہ تھا۔ قیامِ کالج کے زمانے میں جب مولانا اس کتاب کی تالیف میں مصروف تھے تو بعض مقامات کے لیے میں نے کچھ مسالا فراہم کر کے دیا تھا اگرچہ وہ بہت ہی حقیر تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ فی الحقیقت تعریف تھی تو بھی بے دیکھے تعریف اتنی بُری نہیں جتنی بے دیکھے مذمت۔ عبدالحق]

مولوی عبدالحق صاحب کا یہ نوٹ بطور تبرک کے محفوظ کیا جاتا ہے وہ حیاتِ جاوید کے مضامین سے ضرور پہلے ہی سے واقف رہے ہوں گے جیسے شبلی بھی پہلے سے واقف تھے۔ ورنہ وہ عبدالحق صاحب کی روایت کے مطابق اسے دیکھنے سے پہلے ہی "کذب و افترا کا آئینہ" نہ کہتے۔ مولانا حالی نے عبدالحق صاحب کو ایک خط (مکتوبات۔ اول۔ ص ۳۴) میں لکھا تھا کہ "جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر کر گل اِسٹے لکھے جائیں ان میں

(باقی حاشیہ بر ص ۱۷۵)

یہ ہے کہ مولانا شبلی کو سرسید کی تحریک سے بعد میں چڑ ہو گئی تھی۔ اس لیے انھیں ان کی خوبیاں بھی خوبیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ سرسید سے چالیس سال اور حالی سے بیس سال چھوٹے تھے اور ان دونوں بزرگوں کے مقابلے میں انھوں نے اپنا علمی دَور بہت دیر میں شروع کیا تھا۔ اس لیے سرسید اور حالی پر ان کی سخت تنقید بھی بے اثر تھی۔

حالی کا فنِ سوانح نگاری

حیاتِ سعدی کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کی اشاعت سے حالی کا مقصد یہ تھا کہ اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کریں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی تحریک پیدا کریں۔ انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں یورپ کے مورخوں کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ

> "زمانۂ حال میں یورپ کے مُورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے، یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرافی نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کی ہے۔ حال کی بیوگرفی میں اکثر مؤرخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام میں خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔"

گویا حالیؔ، یورپ کے فنِ سوانح نگاری سے واقف تھے کہ حالات کی تدقیق بھی کی جائے اور ان سے استفادہ بھی کیا جائے۔ یادگارِ غالب کی اشاعت اور اس فن کے مقصد سے متعلق اس کے دیباچے میں بھی اسی طرح فرماتے ہیں کہ

"اگرچہ مرزا کی لائف ..... ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بایوگرفی سے حاصل ہونے چاہئیں لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو، ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اس کے سوا ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً، ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات سے اگرچہ قوم کو براہ راست معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا، ان کے ورکس میں چھان بین کرنی اور اُن کے نوادر افکار سے مستفید ہونا قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔"

قریب قریب انھی جذبات کے ساتھ مولانا حالیؔ نے حیاتِ جاوید کو مرتب کیا تھا۔ اس کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"سر سیّد احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں اُنھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے

ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ، قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو درپیش ہے براہِ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم[1] بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لیے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہوں گی۔"

پھر آگے چل کر اسی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

"اس بزرگ (سر سیّد) کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔"

پھر اپنی سابقہ سوانح عمریوں یعنی حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کا مقابلہ حیاتِ جاوید سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہم نے جو دو ایک مصنّفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے ان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ہم کو

---

[1] افسوس کہ یہ محکومی، پاکستان بن جانے کے بعد زیادہ قوی ہو گئی ہے۔

اِس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصّب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما، ومفسّرین کو للکارا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ . . . . ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔“ ؎۱

حالی نے سرسیّد کی اسی ”نکتہ چینی“ کو ان کی ”مذہبی خدمات“ کہا ہے جس کی وجہ سے

”وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے . . . . . پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آپہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے ان کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور ان کی نظر سے گزران دیتے۔“ ؎۲

؎۱ حیاتِ جاوید کے دوسرے حصے میں ”مذہبی تحقیقات“ کے عنوان سے سرسیّد کی مذہبی اوّلیات بڑے شدومد کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور اس سے پہلے ”ریفارمیشن اور اس کا منشا“ کے ذیل میں ان لوگوں پر تعجب کیا گیا ہے جو سرسیّد کو مجدّدِ مذہب نہیں مانتے۔ لکھتے ہیں کہ ”سرسید کی نسبت یہ اعتراض اکثر سنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدّدِ مذہب ایسا شخص کیونکر ہو سکتا ہے جو علوم مروجۂ اسلام میں متوسط درجے سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔“

؎۲ ایضاً دیباچہ۔

حالی نے سرسیّد کی لائف کو جس انداز سے دیکھا اور پرکھا تھا اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے جو کتاب کے آخر سے لیا گیا ہے :۔

"اگر مسلمان سے مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے، نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقینِ واثق رکھتا، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دینے والا، غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اس کی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبیؐ کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلّت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راست باز ہو اور برائی کی عوض میں بھی بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سید احمد خاں جیسا مسلمان زمانے میں مشکل سے ملے گا۔"

گویا ان الفاظ میں حالی نے اپنی تحریر کا مقصد اور سرسید کی حیات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ حالی نے جو سوانح نگاری کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا ہے کہ قوم ان سوانح سے مستفید بھی ہو تو کیا وہ مقصد بھی پورا ہوا ہے؟ ـــــ تو اس استفادے کا اعتراف بھی حالی نے ایک جگہ اس طرح کیا ہے کہ :۔

"سر سید کی ہر قسم کی اصلاحیں انھوں نے (پنجاب والوں نے) سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انھوں نے سر سید کی تقلید اختیار کی، یہاں تک کہ ان کو زندہ دلانِ پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سر سید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھیرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا۔" ؎۱

حالی کی سوانح نگاری کے مقاصد و فوائد معلوم کرنے کے بعد مناسب ہے کہ ہم اس فن میں ان کے اندازِ فکر کا بھی ایک جائزہ لے لیں۔

حیاتِ سعدی کے آخر میں انھوں نے اچھے شعر کے لئے جو شرائط پیش کی ہیں انہی کو شرح و بسط کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری میں پیش کیا ہے پھر انہی کو پیشِ نظر رکھ کر غالب کی شاعری پر بھی بحث کی ہے۔ سادگیِ مضامین کے لیے ندرتِ اسلوب اور عام مضامین کے برخلاف ندرتِ مضامین بھی غالب کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ سر سید کے یہاں یہ خصوصیات تو نہیں بتائی گئیں لیکن مقدمۂ شعر و شاعری میں سادگی، اصلیت اور جوش کو جس طرح سراہا گیا ہے اس کی صراحت سر سید کے ذیل میں بھی آتی ہے:

"بے شک کلام کے مؤثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضروری ہے"

؎۱ حیاتِ جاوید۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۹ء۔ دوسرا حصہ صفحہ ۲۸۸ حالی نے اسی سلسلے میں اور لوگوں کے استفادے کا ذکر بھی کیا ہے۔

مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو جب تک کہ متکلم کا دل، آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو، کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا . . .
. . . سر سید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ دراصل ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھی۔" [1]

حالی کا ایک اور رجحان یہ ہے کہ وہ اپنے "ہیرو" میں حقیقت پسندی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ سر سید کے متعلق ہم نے ابھی ایک اقتباس میں پڑھا ہے کہ وہ مختلف حقائق کے لیے کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ ذاتی طور پر تحقیق کرتے تھے۔[2] اسی طرح انھوں نے غالب کے متعلق بھی لکھا ہے کہ

"مرزا کی درّاکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے کہ جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا، ناجائز سمجھا جاتا تھا، اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔" [3]

حالی کا ایک رجحان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے "ہیرو" میں صلحِ کُل اور مذہبی رواداری کا جذبہ تلاش کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کے یہاں یہ جذبہ ضرور ہوگا جیسا کہ حالی نے لکھا ہے کہ "بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔" [4]

---

[1] ایضاً ص ۳۵۹ -
[2] ایضاً ص ۳۔۲۷۲ - ۲۷۴ - سر سید کے کئی خطوط نقل کیے گئے ہیں جن میں تقلید کی مخالفت ہے — [3] یادگارِ غالب ۔ مطبوعہ کان پور ۱۸۹۷ء ۔ صفحہ ۸۶
[4] حیاتِ سعدی (خاتمہ)۔

یہی بات انھوں نے مرزا غالب کے متعلق بھی لکھی ہے کہ "اگرچہ مرزا کا اصل مذہب، صُلحِ کُل تھا، مگر زیادہ تر اُن کا میلانِ طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا۔" [۱]

اسی طرح سرسیّد کے متعلق لکھا ہے کہ

"اگرچہ سرسیّد فطرۃً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض ان کی سرشت میں داخل تھا مگر ان کی ابتدائی روک ٹوک اور حسنِ تربیت سے یہ تمام ملکات ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔" [۲]

حالی کا ایک رجحان یہ بھی ملتا ہے کہ غالباً وہ اپنی نیک نفسی کی وجہ سے ان اعتراضات کا "مدلل" جواب بھی دیتے ہیں جو اُن کے "ہیرو" پر کیے جاتے ہیں۔ حیاتِ سعدی میں ان اعتراضات کا جواب بھی ہے جو سعدی کے بعض اقوال و اشعار[۳] پر کیے گئے ہیں اور ایران کی امرد پرستی کی توجیہ بھی ہے۔ یادگارِ غالب میں بھی ایسے جملے نظر آتے ہیں جن پر تامل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:-

"(مرزا) چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔" [۴]

---

[۱] یادگارِ غالب (ایضاً) صفحہ ۷۶۔ لیکن خود غالب کا عقیدہ یہ ہے کہ "مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر جانتے ہیں" (خط بنام مرزا علاء الدین علائی)

[۲] حیاتِ جاوید۔ دوسرا حصہ۔ صفحہ ۵۸۴۔ لیکن سرسید کا وہ خط بھی ملاحظہ ہو جو ہماری اسی کتاب کے صفحہ ۳۰۷ کے حاشیے میں درج ہے۔

[۳] حیاتِ سعدی صفحہ ۱۱۴ - ۱۱۹۔ [۴] یادگارِ غالب صفحہ ۲۹

معلوم نہیں یہ "برائے نام" بازی کس "ادائے فریضہ" کے لیے تھی! ـــ ایک اچھی توجیہ "نا ملائم الفاظ" کے لئے بھی آتی ہے کہ :-

"بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہِ شوخیٔ طبع کے صاحب برہان کا جابجا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظِ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اسوجہ سے مخالفت ہوئی۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ، جو آج کل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں اُن کے لئے کنج خمول و گم نامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سر برآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں"۔ [۱]

ایک جگہ غالب کے اعلیٰ ظرف کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ

"وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے"۔ [۲]

اسی کے ساتھ وہ غالب کے ایک ایسے دوست کا واقعہ بیان کرتے ہیں جن کی مالی حالت غدر کے بعد سقیم ہو گئی تھی اور غالب نے بڑی خوبی کے ساتھ ان کا چھینٹ کا

---

[۱] یادگار غالب۔ ص ۴۴ و ۴۵۔ حالی نے ایک نظم میں سرسید کی تصانیف کی تردید کو ذریعہ معاش کہا ہے۔

[۲] ایضاً صفحہ ۶۳۔ لیکن یہ بھی مذکور ہے کہ غالب نے غدر میں اپنے بھائی مرزا یوسف کی کوئی امداد نہیں کی بلکہ ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوئے۔ نواب شمس الدین کے سلسلے میں مہر صاحب نے (غالب۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۷) بھی لکھا ہے کہ "یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مخبری کی ہو"۔

فرغُل لے کر اپنا نیا چغہ انھیں دیدیا تھا۔[1]

ان رجحانات کے باوجود حالی نے سوانح نگاری کے فن کو بہت ترقی دی اور اس سے متعلق جو نظریات یا اغراض ان کے پیش نظر تھے ان کو ہمیشہ ملحوظ رکھا

[1] مہر صاحب نے (غالب مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ء صفحہ ۳۴۵) مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب کے دوست مفتی آزردہ تھے۔ آزردہ نے بھی صدر الصدور کی حیثیت سے جب قرض کے مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف دیا تھا تو خود ہی سارا روپیہ ادا کر دیا تھا، لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ کے ساتھ غالب کا رویہ عجیب رہا۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

خواجہ احمد فاروقی صاحب نے رسالہ آج کل (دہلی، فروری ۱۹۵۲ء) میں آزردہ کا ایک غیر مطبوعہ خط (دار الانشاء، سرکار رام پور، مثل نمبر ۲۵۶) نقل کیا ہے:۔

"۔۔۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمٰن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پیش کیا ہے اور نہایت لئیق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کے سپرد کئے جاتا ہوں۔ اگر ناگوارِ خاطرِ عاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسنِ سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا۔"

یہ خط آزردہ نے اپنے انتقال سے صرف ایک دن پہلے یعنی ۱۵ر جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھا تھا۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب اسی کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"طرفہ لطیفہ ہے کہ غالب نے آزردہ کے انتقال کے بعد، جن سے زندگی بھر اُن کے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میرو مخدوم و مطاع اور والی و مولا سبھی کچھ کہا تھا۔ نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابلِ اعتراض ہی نہیں، عبرت انگیز بھی ہے (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

حیاتِ سعدی میں جہاں حضرت سعدیؒ کے سوانح سے قوم کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے وہیں اُن کی ایسی شاعری سے پرہیز کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے جو قناعت اور توکل پر مشتمل ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہوگئی ہو اور اولوالعزمی کا تخم ان کی طبیعت میں جل گیا ہو اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں، اس وقت دنیا سے ان کا دل سرد کرنا اور قناعت و توکل کا ان کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اس کو گل کر دینا۔ ۔ ۔ ۔" [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ہم وہ غیر مطبوعہ خط بجنسہٖ نقل کرتے ہیں:۔

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت بسلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدرالدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ امین الرحمٰن اس کا بھانجا ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں۔ اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ سے۔ ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حینِ حیات قرار پائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(حاشیہ صفحۂ ھذا)

[۱] حیاتِ سعدی، صفحہ ۱۶۴۔

حالی اپنے "ہیرو" کی بعض خامیوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ قاطعِ برہان پر غالب کے بعض اعتراضات (صفحہ ۷۴) کی نشان دہی بھی کی ہے اور حیاتِ جاوید میں سرسید کی تفسیر پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ سرسید کی "خودرائی" اور "ہٹیلے پن" کی توجیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

> "با ایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسیدؔ کی خودرائی یا وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے؟ . . . . " [1]

بہرحال، حالی نے اپنے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا اور اُسے اس قدر ترقی بخشی کہ آج تک اردو ادب میں اس فن پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ انھوں نے اپنے ایک خط [2] (مکتوبات۔ دوم ص۲۴۱) میں اور پھر اس قطعے میں اس کامیابی کا راز بھی بتایا ہے :۔

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے   اُس نے کی تاخیر، اُس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا، کیونکر کیا، یہ پوچھتا کوئی نہیں   بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا، کیسا کیا

---

[1] حیاتِ جاوید۔ دوسرا حصہ۔ صفحہ ۶۲۳

[2] اسی خط میں لکھا ہے کہ "عربی کی ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسے ہوا۔"

حالی اور شبلی کا فن

آج کل حالی کی سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ شبلی کی سیرت نگاری پر بھی بحث کی جاتی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ ان کے فن کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔ انھوں نے المامون (۱۸۸۹ء) کے شروع میں لکھا ہے کہ "تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے۔ انھیں ریشہ دوانیوں کا پتا لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع و ایجاد پر زیادہ تر ناز ہے وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے"۔

سرسید نے اس کتاب کے دیباچے میں بھی شبلی کی تاریخ نویسی کے متعلق لکھا ہے کہ "باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح و دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے"۔

سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) کے دیباچے میں شبلی لکھتے ہیں کہ "المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس

کتاب کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کے نہیں آچکیں" ــــ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ "مسلمانوں میں علمِ رجال کی جو ترقی ہوئی، دنیا میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں . . . لیکن خاص سیرت (لائف) کے فن کو چنداں ترقی نہیں ہوئی۔ علماء، شعراء، قضاۃ، حکما میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کے حالات مستقل تصنیفوں میں لکھے گئے" ــــ پھر اور آگے کہتے ہیں کہ "امام ابو حنیفہؒ کی زندگی کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ ولادت، نشو و نما، طریقۂ معاش، طرزِ معاشرت وغیرہ۔ اس قسم کے حالات تاریخی پیرایہ رکھتے ہیں۔ روایت میں ان کا ثقہ ہونا، نہ ہونا محدثانہ بحث ہے۔ ان کے مسائل و طریقۂ اجتہاد پہ رائے قائم کرنی مجتہد کا کام ہے۔ اس لئے جو کتاب ان تمام حیثیتوں پر شامل ہوگی ضرور ہے کہ مختلف بحثوں میں خود اس کی حیثیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ اس کا طرزِ تحریر کہیں مؤرخانہ ہوگا، کہیں محدثانہ، اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ مجتہدانہ روش ہوگی۔ اس کتاب میں میں نے ان مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے"۔

اس اقتباس کے آخری الفاظ بہت اہم ہیں کیوں کہ شبلی نے اپنی سیرت کی تمام کتابوں میں انہی باتوں کا لحاظ رکھا ہے۔

الفاروق کی تالیف یوں تو سیرۃ النعمان سے پہلے شروع کر دی گئی تھی جیسا کہ موخرالذکر کے دیباچے میں ہے لیکن اس کی تکمیل ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ اس کے دیباچے میں تاریخ کی دو باتیں لازمی قرار دی ہیں" ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام

واقعات میں اسبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جاتا ہے۔ دیکھیے شبلی اور حالی کی راہیں الگ ہیں۔

شبلی نے آگے چل کر اسی دیباچے میں روایت ودرایت کے اصولوں پر بحث کی ہے کہ واقعات کی صحت کا معیار کس طرح متعین کیا جاتا ہے اور اسلام کا احسان اس فن پر کس قدر ہے — یہی چیز سیرۃ النبیؐ (۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء) کے دیباچے میں بھی بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عموماً سیرت کی کتابوں میں کیا کمی رہ گئی ہے۔ اسلامی فنِ روایت کے متعلق تفصیل سے بحث کرکے لکھتے ہیں کہ یہ فن "عقل ودرایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ — علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لیے کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی، کتنی دقّت رسی صرف کی ہے۔ کیا اس اہتمام واعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبرِ اسلام میں سے کسی نے بھی اس جاں کاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد واصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟"

پھر تصنیف وترتیب کے وہ اصول بھی بتائے ہیں جو انھوں نے اختیار کیے ہیں یعنی قرآن پاک کی تصریحات یا اشارات سے اختلافی مباحث کا فیصلہ کیا ہے، اکثر تفصیلی واقعات حدیث کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر مہیا کیے ہیں جو اہلِ سیر کی نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔ روزمرّہ اور عام واقعات کے لیے ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں بھی لے لی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے۔

اب خود فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی اور حالی میں سے کس کا کام مشکل تھا اور شبلی نے سیرت نگاری کی ہے یا سوانح نگاری۔ شبلی نے الغزالی (۱۹۰۲ء) میں صرف انہی کتابوں پر توجہ دی ہے جن میں عقلیات کے مباحث ہیں، سوانح مولانائے روم میں مثنوی کو عقائد اور

علم کلام کی بھی عمدہ کتاب کہاہے اور ثابت بھی کیا ہے۔ لیکن یہ سب کتابیں سوانح سے کم تعلق رکھتی ہیں۔ تاریخ، فلسفہ اور اخلاق، شبلی کے پسندیدہ علوم ہیں اور انہی علوم سے استفادہ اور افادہ اُن کا عین مقصد ہے۔ "ناموران اسلام" سے بھی یہی علوم حاصل ہوئے ہیں اور سب سے بڑی بات شبلی کے لیے یہ ہے کہ :-

ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سنہ ۱۸۹۹ء

سرسیدؔ کی تفسیر کی حمایت :

سنہ ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی نے سرسیّد[۱] کی تفسیر کی حمایت میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟" اس مضمون میں مولانا نے پہلے محکمات کی تشریح کی ہے۔ پھر متشابہات کا مقصد سمجھایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴) ایک شخص (مؤلف فرہنگ آصفیہ) کا نام ہونے سے اور ایک (شبلی) کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔" تاہم یہ حقیقت ہے کہ شبلی نے اپنے مضمون "سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر" کے آخر میں حالی اور حیاتِ جاوید کی تعریف ضرور کی ہے۔ اور صفحہ ۹۹ میں ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ شبلی نے حیاتِ سعدی کی اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کیا ہے لیکن عبدالحق صاحب یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ آزاد کی طرح شبلی نے بھی حالی کی کسی کتاب کی کوئی تعریف نہیں کی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] سرسید کی تفسیر کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ کل چھ جلدیں چھپ چکی تھیں اور ساتویں جلد سورۂ انبیا تک بے چھپی رہ گئی تھی جبکہ انتقال ہوا۔

ہے اور اپنے بیان کی تائید امام فخر الدین رازی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اقوال سے کی ہے۔ خلاصہ یوں کیا ہے کہ "قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کے فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے امیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا، ان کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ امی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔"
اسی بنیاد پر مولانا حالیؔ نے اپنے مضمون کی تعمیر کھڑی کی ہے اور انجیل و زبور سے بھی متشابہات نکالے ہیں اور آگے چل کر اسلام کا اس باب میں یہ قاعدہ مسلم ٹھیرایا ہے کہ "جب نصِ شرعی کے حقیقی معنی، دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔" پھر لکھا ہے کہ پہلے زمانے میں علمی تحقیقات نہایت محدود تھیں اسی لیے بہت سی آیاتِ متشابہات کی تاویل نہیں کی گئی۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح وجائز کر دیتی ہیں اور سرسید کی تفسیر پر اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ "جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔" بہرحال مولانا حالیؔ نے جس رنگ میں سرسید کی تاویلات کی تائید کی ہے اس پر اظہارِ خیال کرنا ہمارے موضوع سے الگ ہے اس لیے اس بحث کو یہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اسی سال مولانا شبلی کی طویل علالت کے بعد صحت حاصل ہونے پر مولانا حالیؔ نے فارسی میں ایک قطعۂ تہنیت لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز	شبلیٔ ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست
آنکہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی ست	آنکہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
آنکہ چوں سر کند افسانۂ فضل و ہنرش	خامہ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم وکاست

مسلم یونیورسٹی کے قیام کیلئے مضمون

اسی سال دسمبر میں محمڈن ایجوکیشنل کا بارہواں اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا۔ مولانا حالی اپنی بیماری کی وجہ سے وہاں نہ جا سکے۔ لیکن علم یونیورسٹی کے مقام کے لیے جو تجویز وہاں پیش ہونے والی تھی اس کی تائید میں ایک مضمون لکھ کر نواب محسن الملک کو بھیجا تھا۔ جس میں بتایا ہے کہ اس کانفرنس کے تمام جلسوں میں یہ تجویز امسال سب سے اہم ہے۔ یہ تجویز مسٹر ماریسن (پرنسپل علی گڑھ کالج) نے سب سے پہلے وہاں پیش کی تھی۔ حالی نے اس کی تائید میں یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت مختلف دلائل سے ظاہر کی اور سر سید کے احسانات بیان کیے جن کی وجہ سے قوم کے تعصب اور جہالت کا خاتمہ ہوا۔ اس مضمون میں حیاتِ جاوید کا پرتو جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے مضمون بھی طویل ہو گیا ہے اور بہت پُر مغز ہے۔ مضمون کا خاتمہ مسدس کے نو بند لکھ کر کیا ہے جن میں پہلا بند یہ ہے:-

بنی نوع کی ہر مصیبت میں یاور ہوا خواہِ ملت بہ اندیشِ کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر
ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

سنہ ۱۹۰۰ء

دیوانِ انور پر تبصرہ:

اس سے قبل سنہ ۱۹۰۰ء[1] کی انجمنوں کا حال اوپر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں

---

[1] ۸ ہر نومبر ۱۸۹۹ء کو مولانا نے ایک ریویو "انشائے نور احمد" پر لکھا تھا۔ بیماری کی وجہ سے اس کا مطالعہ لیٹے لیٹے کیا اور چند کلمات ہی لکھے۔ ایک جملہ ضرور نقل کیے جانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ "بلا تصنع لکھتا ہوں کہ اردو میں آج تک میں نے کوئی انشا اس سے

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۹۸)

انور دہلوی کا دیوان شائع ہوا تو اس پر مولانا نے تبصرہ لکھا۔ اس کی ابتدا ان کی رباعی سے ہوتی ہے :-

غالب ہے، نہ شیفتہ، نہ نیر باقی وحشت ہے، نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اس کے بعد تبصرہ کی جو تمہید ہے وہ سوز و گداز سے بھری ہوئی ہے اور سلاست کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کی چاشنی سے بہت میٹھی ہو گئی ہے۔ لکھتے ہیں :

"وہ زمانہ جب کہ دلی نے اپنے آخری وقت میں تھوڑی دیر کے لیے سنبھالا لیا تھا، اگرچہ اس وقت پرانے کمالات کی سوتیں آئندہ کے لیے بالکل بند ہو گئی تھیں، مگر اگلے زمانے کے بچے کھچے اہلِ کمال سے شہر بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا۔ باغ میں خزاں کے آثار نمودار ہو گئے تھے، لیکن مرغانِ خوش الحان خزاں کی آمد آمد سے بے خبر، بدستور ہر طرف چہکتے نظر آتے تھے، دلی کا یہ اخیر جھمکڑا جس کے تصور سے دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اس کے پس ماندہ قافلے کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے دنیا سے رخصت کیا ہے۔

اب مو لیجئے گل پہ ہوا کب ل جڑیں ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

اسی قافلے میں ایک جوان صاحب کمال سید شجاع الدین حسین انور تھے"

(بقیہ صفحہ ۱۶۰) سے بہتر نہیں دیکھی" یہ کتاب مڈل اور پرائمری اسکولوں کے طلبہ کو خطوط نویسی سکھانے کے لیے مرتب کی گئی تھی۔

اس تبصرے میں نہ صرف تمہید بلکہ پورا مضمون اسی انداز کا ہے اور دلی کی اُٹھتی ہوئی محفل کا بہت دلکش مرقع پیش کیا ہے۔ سید انور، شیدا، ظہیر، سالک[1] داغ وغیرہ کا ذکر بڑے دل گداز طریقے پر کیا ہے اور اس زمانے کے لوگوں کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تبصرہ اس زمانے کی اردو شاعری کی تاریخ کے سلسلے میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے۔ اس کے علاوہ اس کی داخلی شہادت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی رباعی کے علاوہ ان اشعار کی غزلیں بھی حالی اس وقت تک لکھ چکے تھے کیونکہ ان کو تبصرے میں پیش کیا ہے:-

(۱) اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں — ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
(۲) بزمِ مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ — یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ[2]

نواب محسن الملک کی معتمدی، اور بھائی اور اہلیہ کا انتقال:

سرسید کی وفات کے بعد ہی حکیم اجمل خاں اور نواب محمد اسحٰق خاں کی کوشش سے علی گڑھ کو اچھی خاصی امداد ملی اور (مکتوبات دوم۔ ص ۲۵۱) کالج کی معتمدی کے سلسلے میں مولوی سمیع اللہ خاں اور سید محمود کے درمیان صفائی ہو گئی اور سید محمود سیکرٹری ہوئے

---

[1] سالک اور قلق وغیرہ کے دواوین پر فارسی تقریظیں بھی مولانا کے فارسی کلام میں موجود ہیں۔

[2] یہ دو شعر بھی تبصرے میں آتے ہیں:-

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

(غالباً جولائی ۱۸۹۸ء میں۔ مکتوبات ص ۲۵۱) لیکن ۸ جنوری ۱۸۹۹ء کے خط سے (ص ۲۶۲) معلوم ہوتا ہے کہ محسن الملک سیکرٹری تجویز ہو گئے۔ اور مسٹر بیک (پرنسپل۔ کالج) نے اپنے اختیارات کی توسیع چاہی۔ مگر مولانا اپنے دوستوں (محسن الملک اور وقار الملک) کی طرح ۱۸۹۰ء کے شروع ہی سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ یورپین اسٹاف کے ہاتھوں کالج کے اختیارات رہیں چنانچہ کالج کے سالانہ جلسے کے لیے ۳۰ جنوری ۱۸۹۹ء کو علی گڑھ (ص ۲۶۴) گئے اور شاید دوسرے دن جلسے کے بعد واپس ہو گئے (ص ۲۶۳) اسی جلسے میں نواب محسن الملک، کالج کے سیکرٹری منتخب ہوئے تھے[1]۔ کالج کے حالات کے متعلق ۲۵ جنوری ۱۹۰۰ء[2] کے خط میں بھی تشویش (ص ۲۸۷) ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مسلسل کئی خطوط میں اعزہ کی بیماری اور پریشانی کا ذکر ہے۔ ۲۳ اگست ۱۹۰۰ء کو ان کی اہلیہ صاحبہ (اسلام النساء) کا انتقال ہیضے میں ہوا (ص ۲۹۵) لیکن متعدد خطوط میں انتہائی صبر و تحمل کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے پہلے ۲ اگست ۱۹۰۰ء کو (ص ۲۹۴) ان کے ایک بھائی محمد علی کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں (ص ۳۰۰) سرسید کی لائف بھی

۱؎ لیکن ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء کے خط سے (ص ۳۰۳) معلوم ہوتا ہے کہ محسن الملک استعفیٰ دے رہے تھے۔ مکاتیب حالی۔ (ص ۳۷) میں سید محمود کی بے اعتدالیاں، مسٹر بیک کی جگہ مسٹر ماریسن کا آنا اور دوسرے قصے ملتے ہیں۔

۲؎ مولانا عبدالحق اس زمانے میں رسالہ افسر حیدر آباد نکالتے تھے۔ انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر کرٹکل آرٹکل لکھے جائیں ان میں ایک شخص (مؤلف فرہنگ آصفیہ) کا نام ہونے سے اور ایک (شبلی) کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا (مکتوبات اول ص ۳۴۳)۔ اس کا ذکر ص ۱۶۴ کے حاشیے پر بھی آ چکا ہے

مکمل ہو رہی تھی۔ اس سال کانفرنس عظیم آباد (پٹنہ) میں (صد۳۰۲) ہو رہی تھی۔

۱۹۰۱ء

لارڈ کرزن، حیاتِ جاوید کی تکمیلِ طباعت، ترجمۂ حالی:

۵ ۲؍ اپریل ۱۹۰۱ء کو لارڈ کرزن علی گڑھ آ رہے تھے (صد۳۰۸) اس لیے مولانا ۲۳؍ اپریل کو (صد۳۱۱) وہاں جلسے میں گئے اور ۲۶؍ اپریل کو واپس پانی پت آ گئے۔ ۹؍ اپریل کے خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ جاوید کانپور سے چھپ کر روانہ ہو چکی ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے مولانا نے اپنے خود نوشتہ سوانح (ترجمۂ حالی) نواب عماد الملک کی فرمائش پر مرتب کیے تھے جس میں حیاتِ جاوید کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"اب سر سید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی۔ جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو گی۔"

یہ "ترجمۂ حالی" دراصل نواب عماد الملک کے کسی انگریز دوست نے لندن سے منگوایا تھا۔ اور (غلام الثقلین اور مولانا عبد الحق ۱۸۹۹ء سے (مکتوبات، اول صد۱۳۰) اس کے لیے مولانا سے درخواست کر رہے تھے۔

ملکۂ وکٹوریہ کا مرثیہ:

۱۹۰۱ء میں مولانا بہت مصروف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس سال کئی ادبی کام کیے۔ نواب عماد الملک کی فرمائش پر جو "ترجمۂ حالی" لکھا تھا۔ اس کا ذکر ایک خط میں (مکتوبات اول صد۱۴۰) آتا ہے کہ اب "انشاء اللہ عنقریب کچھ اپنا حال لکھوں گا۔"[۱] اسی

---

[۱] ۱۱؍ مارچ ۱۹۰۱ء کے خط میں (مکتوبات اول صد۱۴۱) ذکر ہے کہ نواب عماد الملک بہادر کی وہ فرمائش پوری کر دی۔

خط میں یہ ذکر بھی ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر، میں نے ایک نظم کچھ اوپر سائٹھ بیت کی۔ کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے لکھی ہے اور اس میں کالج کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اتفاق سے انہی دنوں میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، نواب محسن الملک کی توجہ سے ازسرِ نو جاری ہو گیا ہے۔ جس کا دوسرا نمبر کل شائع ہو گیا ہو گا اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ علی گڑھ ہی سے وہ پہلی بار شائع کی جائے۔" یہ مرثیہ ترکیب بند کے چھ بند پر مشتمل ہے اور آخری اشعار کے علاوہ ہر بند میں دس دس شعر ہیں۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

شاہ ہوں یا ہوں گدا، محکوم ہوں یا حکمراں
وہ نہیں مرتے کبھی، جیتی ہیں جن کی نیکیاں
جاگتا ہے ان کا تا روزِ قیامت نامِ نیک
گو کہ ہیں وہ بے خبر سوتے لحد کے درمیاں

اس کا تیسرا بند اس لیے اہم ہے کہ دوسرے بند کے آخری شعر سے لے کر تیسرے بند کے آٹھویں شعر تک ہر شعر میں انجیل کی کوئی نہ کوئی تلمیح موجود ہے۔ مولانا نے حواشی میں ان کے متعلق حوالے بھی دے دیے ہیں۔ یعنی انجیل (متی باب پنجم) کی آیات کے مضامین نظم کر دیے ہیں۔ مثلاً انجیل کی یہ آیات ہیں :-

۱ - مبارک وہ جو غمگین ہیں۔ کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔
۲ - مبارک وہ جو صلح کرانے والے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔
۳ - مبارک وہ جو پاک دل ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔

انہی آیات کو مرتباً ان اشعار میں پیش کیا ہے :-

لہ مولانا پہلے مجلس خزانۃ البضاعت ''ڈاکم اے او کالج فنڈ کمیٹی'' کے ممبر اور دسمبر ۱۸۹۱ء سے ٹرسٹی ہو گئے تھے۔

وہ تسلی پائیں گے دُنیا میں جو جھیلیں گے غم　　ہو چکے غم، بس تسلی دے گی اب راحت تجھے

تو مبارک تھی کہ تجھ کو صلح تھی دل سے پسند　　دے گا فرزندی کا اب اپنی خدا خلعت تجھے

تو مبارک تھی کہ تھا پہلو میں تیرے پاک دل　　ہو مبارک خلد میں دیدار کی نعمت تجھے

یہ نظم چونکہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی کی حیثیت سے مولانا نے لکھی تھی۔ اس لیے کالج کا ذکر بھی لایا گیا ہے:۔

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ
ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار
اس کی رسمِ فاؤنڈیشن[1] اور جشنِ قیصری
دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار
نیو رکھنے اس کی یاں آیا ترا قائم مقام
تو نے خود اس کو کتابیں بھیج کر بخشا وقار
جب تلک قائم ہے کالج، جب تلک باقی ہے قوم
یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار

گدایانِ قوم کے لیے اشعار:

اسی زمانے میں پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے، جنھوں نے اپنی جماعت کا نام "گدایانِ قوم" رکھا ہے۔ ریاست بہاول پور میں چندہ وصول کرنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار

---

[1] یہ اضافت عمداً اختیار کی ہو گی۔ ان اشعار کی تلمیحات کی وضاحت خود مولانا حالی نے نظم کے حواشی میں فرما دی ہے۔

پڑھنے کا تھا لیکن غالباً ان کا جانا نہیں ہوا[1]" یعنی مولانا نے ان لوگوں کی فرمائش پر دس شعر اس مقصد کے لیے لکھے تھے :-

"گدایانِ قوم" پر نظم :

ڈھونڈنے خضرِ مبارک پے کو یاں آئے ہیں ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم

ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سُن کر نہ ہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم

ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لے کے اس کا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم

علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے
آج اس مدرسہ پہ اِسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم

انہی "گدایانِ قوم" پر ایک نظم اسی سال ۵۶ شعروں کی بھی لکھی تھی۔ اس[2] میں کنزرویٹو اور لبرل کے نقطۂ نگاہ سے ان گدایانِ قوم پر تبصرے کیے گئے ہیں جن میں کوئی شمس العلماء ہے کوئی سر اور خان بہادر ہے۔ کوئی ڈاکٹر یا شاعر ہے اور جب یہ لوگ بھیک مانگتے ہیں تو کوئی دعا نہیں دیتے :-

پر یہ دلاتے نہیں کوئی اُمید ۔۔۔ دیتے بشارت ہیں نہ کوئی نوید
وعدۂ عقبیٰ نہیں کرتے کبھی ۔۔۔ خلد کی ہامی نہیں بھرتے کہیں

---

[1] آگے آنے والے اشعار کے حاشیے پر مولانا کی عبارت بھی ہے۔

[2] مولانا حالیؔ "حامی" ہی لکھتے تھے جیسے بیان ہے۔ (تہذیبِ حالی کراچی صفحہ ۱۰۱) میں ہے (ماتی بعد)

کہتے ہیں یہ صاف بصد رشد و مد — بیع ہے وہ جس میں ہو داد و ستد
کہتے ہیں دینے سے رکھو کام تم — لینے کا زنہار نہ لو نام تم
داد و دہش ورنہ اکارت ہے یہ — یہ نہیں خیرات، تجارت ہے یہ

قرونِ اُولیٰ کی حق گوئی پر مضمون:

اسی سال رسالہ معارف[5] (مرتبہ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم) بابت ستمبر میں مولانا حالی کا ایک مضمون "قرونِ اُولیٰ کی حق گوئی و حق پسندی" شائع ہوا۔ یہ مضمون بڑی محنت سے لکھا ہے۔ اس میں حضرت عمر فاروق رض کے واقعات، عقد الفرید میں سے مسلمان عورتوں کی حق گوئی کے قصے یعنی زرقا، امِ سنان، عکرشہ، جحونیہ، ام الخیر، وغیرہ سے متعلق روایات نقل کی ہیں اور قوم کو غیرت دلائی ہے۔

"ترجمہ حالی" بھی اسی سنہ ۱۹۰۱ء کی یادگار ہے جس کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ حالی کے خود نوشتہ سوانح ہیں۔ اس کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے۔

کلیاتِ دلگیر پر تبصرہ:

اسی سال منور خاں دلگیر میرٹھی کے کلیات پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ یہ شاعری دراصل دوآب و ہریانہ کے دیہات کی بولی میں ہے۔ اسی لیے لسانیات کے شائقین کے لیے بہت مفید ہے۔ دلچسپ ہے اس کلیات کی بعض نظمیں (جو بعد میں پڑھ کر کلیات بننے

(بقیہ حاشیہ) لیکن جناب مفتی اکبر حسن ابن انسار صدیقی صاحب نے تاہیں لکھا۔ ملاحظہ ہو خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) کا مقدمہ (صفحہ نہا)۔

[5] یہ رسالہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ سے سلیم مرحوم نے نکالا تھا۔ تین جلدوں کے بعد بیمار ہو گئے تو اسے پانی پت لے گئے وہاں جنوری ۱۹۰۱ء سے پھر شروع کیا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے دسمبر میں بند ہو گیا۔

کا موجب ہوئیں) ۱۸۵۰ء میں بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں پیش کی تھیں جہاں انھیں بہت انعام و اکرام حاصل ہوا۔ مولانا حالی نے اس کلیات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس میں مضمون اور پیرایۂ بیان دونوں دیہاتی ہیں اور یہ دلمیر کا واقعی کمال ہے۔ مولانا حالی نے اس کی زبان کو گنواری کہا ہے لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ زبان گنواری کم ہے اور بھاشا زیادہ ہے۔ مثلاً :-

تیس پانی سوں مانس کیسنا　　　سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا

تیرے سانچے ایک نرالے　　　جن سانچوں لکھ کایا ڈھالے

اس کلیات کی زبان میں بندیل کھنڈی اور ہریانوی دونوں اثرات ہیں اور واقعی ہندوستانی لسانیات کے باب میں اہم ہے۔

ایک ترکیب بند :

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سر سید کے انتقال کے بعد ہی حکیم اجمل خاں اور نواب محمد اسحٰق خاں کی کوششوں سے والی رام پور نے علی گڑھ کی امداد فرمائی۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ اس سال ۱۹۰۱ء میں دسمبر کے آخر میں رام پور ہی میں رکھا گیا۔ مولانا حالی نے اس موقع پر ایک نظم "ترکیب بند" کی صورت میں لکھی لیکن اپنی پریشانیوں کی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکے اور اسی حالت میں رام پور میں سنائی۔ اس میں کل چار بند ہیں، اور آخری اشعار کے علاوہ پہلے بند میں چودہ شعر، دوسرے میں تیرہ، تیسرے میں گیارہ اور چوتھے میں صرف

۱؎ دیوان میر کی تلاش مولانا حالی کو ۱۹۱۲ء میں بھی ہوئی تھی جیسا کہ مکتوبات حالی (اول ص ۱۱۶) کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔

۲؎ ۲۶ اگست ۱۹۰۱ء والے خط میں (مکتوبات اول ص ۱۳۶) حالی کا ایک شعر یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل اس وقت لکھی جا چکی تھی :-

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے　　　بس اب یاروں سے فرمانا پڑے گا

۳؎ مولانا کو نمونیا ہو گیا تھا اور ضعف بڑھ گیا تھا۔ (مکتوبات اول ص ۲۴)

اس شعر میں حسبِ معمول سلاست اور روانی کے دریا بہائے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

صاحبو! سمجھو نہ اس جلسے کو ہر گز سرسری — ہیں مُربّویں اور اُمیدیں کوٹ کوٹ اس میں بھری
اب تلک اس جہاز کی سیکڑوں کا کوئی بندھن نہ تھا — جس سے لڑنے کو تھی اک فوج لیکن بے سری
اہلِ ملک و جاہ جو ہیں قوم کی اُمید گاہ — سب نظر آتے تھے ہمدردی کی تہمت سے بری
دور ہی دور ابر دریا دل برستا تھا سدا — قوم کی کھیتی نظر آتی نہ تھی ہوتی ہری
سر میں کچھ سودا تھا جن کے قوم کی تعلیم کا — تھیں فقط دینے کو ان کے پاس اسپیچیں نری
گو فصاحت اور بلاغت ان کی تھی ضرب المثل — گو کہ اسپیچیں تھیں ان کی سر بسر جادو بھری
سُننے والوں پر مگر چلتا نہ تھا اُن کا فسوں — کوئی کافر جانتا تھا ان کو کوئی نیچری
قوم کی تعلیم کا عقدہ تھا لاینحل ہوا — پیش جاتی تھی نہ کچھ تدبیر کی کاریگری
جب ان دل بڑھا ئنس حامد علی خاں پر نثار — جو ہوا ہے اک شاعر کس مخز کا مشتری
آج سے وہ سب مسلمانوں کے سر کا تاج ہے — دے رہی ہے یہ شہادت قوم کی مجلس بھری

دوسرے بند میں تعلیم کی اہمیت بتائی ہے۔ تیسرے بند میں رام پور کے بہادر اسلاف کی اولاد کو خطاب ہے کہ وہ تعصب اور جہالت جیسے دشمنوں کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور آخری بند میں اسی جہالت والے رسم و رواج کو ختم کرنے کے لیے نصیحت ہے۔

۱۹۰۲ء

اس کے بعد ۱۹۰۲ء کی ابتدا ہوتی ہے۔ شروع کے حالات تو معلوم نہیں ہیں لیکن مارچ سے وہ مصروف نظر آتے ہیں۔ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء کے خط میں (مکتوبات اول صفحہ) لکھتے ہیں:-

" حیدر آباد کے پے در پے انقلابات سے متوسلین سرکارِ عالی پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی ہے ہر جگہ مسلمان اپنے ہاتھوں سے برباد ہوتے جاتے ہیں :-

دیں غیر دشمنی کا ہماری جنہاں چھوڑ | یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر | کی نیند کیوں حرام ؟ بس لے انتظار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی | تا کل نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

تحفۃ الاخوان :

اب اس جگر خراش داستان کو ختم کرتا ہوں اور موہوم اُمیدوں کا ذکر کر کے آپ کا اور اپنا دل خوش کرتا ہوں۔ دربار قیصری (یعنی ایڈورڈ کا دربار) یکم جنوری ۱۹۰۳ء میں اگر خدا کو منظور ہے تو حضور (میر محبوب علی خاں) ضرور تشریف لائیں گے اور ان کے ہم رکاب دیگر امرائے حیدر آباد بھی دہلی پہنچیں گے۔ اس سال کانفرنس کا اجلاس دہلی میں قرار پایا ہے اور کارکنان کانفرنس کا خیال ہے کہ کسی اجلاس میں حضور کو بھی مدعو کیا جائے۔[۲] لیکن ۱۹۰۲ء میں صحت کی خرابی کی وجہ سے کوئی اور کام نہیں کیا۔ شروع دسمبر میں (مکتوبات

---

[۱] ۱۹۰۱ء کے ماہ اگست میں نواب وقار الامراء اپنے عہدہ مدار المہامی سے مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ مہاراجہ کشن پرشاد مقرر ہوئے۔ اس کے نتیجے میں مولوی سید علی بلگرامی جو محکمہ تعمیرات و معدنیات و ریلوے کے معتمد تھے۔ بائیس سال کی ملازمت کے بعد علیحدہ کر دیے گئے۔ ان لوگوں کے ہٹنے سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے جو ان سے وابستہ تھے۔

[۲] اسی خط میں غزل کا ایک شعر ہے :-

ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل | اس لیے ہم بن جے مہماں ہونے کو ہیں

اول۔ص۱۵۱) کانفرنس کے لیے مولانا نے نظم لکھنی شروع کی تھی لیکن انہی دنوں ان کی صحت نے جواب دے دیا اور مختلف شکایتیں پیدا ہو گئیں (مکتوبات اول ص۵۴) تاہم کسی صورت سے وہ نظم پوری کی۔ اسی کا نام تحفۃ الاخوان ہے جو کانفرنس کے اجلاس میں دسمبر ۱۹۰۲ء کے آخر میں دہلی میں پڑھی گئی۔ اس ترکیب بند میں سات بند ہیں اور آخری اشعار کے علاوہ بند کے اشعار کی تعداد مختلف ہے پہلے بند میں دس شعر دوسرے میں تیرہ تیسرے میں چودہ، چوتھے میں نو، پانچویں میں چودہ، چھٹے میں تیرہ اور ساتویں میں بیس شعر ہیں۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے :۔

دوستو انکار اگر تم کو بداہت کا نہیں
عالمِ اسباب ہے دنیا اسے جانو یقیں
کاہ سے لے کوہ تک، ذرّے سے لے تا آفتاب
سب کو ہے جکڑے ہوئے اسباب کا حبل المتیں
اِک مرتب سلسلہ پاؤ گے واں اسباب کا
دشت میں پتا کھڑکتا تم اگر دیکھو کہیں
یُوں خدا چاہے تو لے اسباب کی تاثیر چھین
لیکن اُس قیوم بے ہمتا کی یہ عادت نہیں
وہ یہی قانون ہے جس سے لگا لیتے ہیں کھوج
وقت سے پہلے ہر اک انجام کا انجام بیں
جان لیتے ہیں کہ آمد ہے خزاں کی باغ میں
ٹہنیوں سے خود بخود جب پتیاں جھڑنے لگیں

لیکن ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ اس کو زمانے کے انقلابات اور مطالبات کی پروا نہیں ہے اور ع "یہ دکھاتے پھرتے ہیں جوہر سلف کے جا بجا" ——— اور معاش کی حالت یہ ہے کہ :-

جتنے اور دیس ہیں ہیں کھاؤ اتنے ہی واں ہیں کماؤ
یاں کماؤ ایک ہے اور کھانے والا قافلہ

تیسرے بند میں بھی قوم کی غفلت کا ذکر ہے :-

نیند غفلت کی ہے سر تا سر مسلط قوم پر
سب کی آنکھیں ہیں کھلی سوتے ہیں لیکن بے خبر
مصر کی ممیاں ہیں سب گویا، نہیں جن میں حیات
گو کہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر

یہی لے آخر تک الاپی گئی ہے اور آخری بند میں فرماتے ہیں :-

قسمتوں کی آزمائش کا زمانہ ہو چکا
ہے بس اب یاں ہمتوں اور غیرتوں کا امتحاں
ہے تمہاری اب تمہارے ہاتھ موت اور زندگی
ہو تمہیں اپنے مسیحا اور تمہیں ہو جاں ستاں
یا کرو کوشش کہ مردہ قوم میں پڑ جائے جان
اور دکھا دو خلق کو اس راکھ سے اٹھتا دھواں
یا رہو دنیا میں جھنگوں اور پشوں کی طرح
جن کا ہے دنیا میں ہونا اور نہ ہونا ایک ساں

قوم گیتی میں ہو گر معدود ملخ سے بھی سوا — مرگئے جب قوم کے دل، قوم میں پھر کیا رہا؟

۱۹۰۳ء

"ہماری معاشرت کی اصلاح" پر مضمون:

یہ نظم آخر دسمبر ۱۹۰۲ء کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں باوجود نقاہت اور پریشانیوں کے تھوڑا سا کام کر لیا تھا۔ رسالہ "عصر جدید" (میرٹھ) کے اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "ہماری معاشرت کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے"۔ اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ہماری قوم میں تقریریں کرنے والے یا مضمون وغیرہ لکھ کر لوگوں کی اصلاح کرنے والے بہت موجود ہیں لیکن چونکہ خود عمل کر کے نمونہ نہیں بنتے اس لیے ان کی خالی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے برعکس آریہ سماج کے ممبروں کی تعداد جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اتنا کہتے نہیں جتنا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ بہت سی ایسی قدیم رسموں کے ترک کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن پر مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور جن کا موقوف ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی برائیوں کو دور نہیں کرتی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر کوئی نصیحت یا ترغیب یا تحریص، کارگر نہیں ہوتی جب تک کسی ثوابِ اُخروی کی امید یا عذابِ اُخروی کا خوف اس میں شامل نہ ہو"۔ اصلاحِ معاشرت کو مولانا نے بہت ضروری قرار دیا ہے اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس نے اصلاح معاشرت کے لیے "جو صیغہ قائم کیا ہے اس کی ابتدا تاجروں سے کی جائے یعنی جو رسالہ یا اخبار اس مقصد کے

لیے جاری کیا جائے اس کو جہاں تک ممکن ہو تاجروں میں زیادہ متداول کیا جائے۔ اور جو دورے ملک میں اس غرض سے کیے جائیں ان میں ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا جائے اور اسپیچوں میں زیادہ تر ان رسموں کی برائی پر زیادہ زور دیا جائے جن کے ترک کرنے سے فضول خرچی اور اسراف کا انسداد مقصود ہے۔" عورتوں کے لیے زمانۂ حال کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے تاکہ فضول رسمیں باقی نہ رہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۳ء میں کوئی اور چیز نمایاں طور پر نہیں ملتی[1] اور یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ اس سال کانفرنس کے جلسے میں تشریف لے گئے تھے یا نہیں۔ البتہ ۲ نومبر ۱۹۰۳ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص۵۷) انجمن حمایتِ اسلام (لاہور) کے جلسے میں شرکت کی خواہش ظاہر کی اور بمبئی کی لوکل کمیٹی کانفرنس میں دعوت کے اصرار کا ذکر کیا ہے جس کے لیے محسن الملک (ص۳۵۲) بھی زور دے رہے تھے۔ چنانچہ بمبئی جانے کا ارادہ کرنا پڑا اور اس مرتبہ بہ نسبت گذشتہ جاڑوں کے کسی قدر اُن کی حالت (ص۳۵۴) بہتر تھی۔ ایک خط میں (ص۳۵۳) لکھتے ہیں کہ "میں انشاءاللہ تعالیٰ ۲۲ دسمبر اور ۱۲ شوال کی شام کو یہاں (پانی پت) سے دہلی اور ۲۴ دسمبر کو سات بجے شام کے چھوٹنے والی ریلوے کے ذریعہ سے بمبئی روانہ ہوں گا اور غالباً جنوری ۱۹۰۴ء کی چوتھی یا پانچویں تک واپس آجاؤں گا۔"

---

[1] مقالاتِ حالی حصّہ دوم میں خواجہ غلام الحسنین کی کتاب "قوانینِ دولت" پر مختصر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ملر بس بل کی انگریزی کتاب "لاز آف ویلتھ" کا ترجمہ ہے جس کے متعلق لکھا ہے کہ ترجمہ بامحاورہ اور فصیح اردو میں ہے اور بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غالباً قریبی رشتے کی وجہ سے زیادہ تعریف نہیں لکھی۔

سنہ ۱۹۰۴ء

لیکن دوسرے خط سے (ص ۲۵۳) معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴؍جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کو پانی پت واپس پہنچے۔ گو کہ وہ ۳؍جنوری کو (ص ۲۵۵) دہلی میں تھے جہاں حکیم محمود خاں مرحوم کے خاندان میں متعدد شادیوں میں شرکت کرنی پڑی۔ لیکن وہاں نہایت درجے کی سردی تھی اس لیے دفعتہً نزلے کی تحریک سے تکلیف بڑھ گئی (ص ۲۵۵) پھر لکھتے ہیں (ص ۲۵۵) کہ عبدالولی کا حال بدستور ہے۔ کبھی زیادتی کبھی کمی۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ۲۳، ۲۴؍فروری کو علی گڑھ جانا پڑے گا۔ مسٹر آرنلڈ ہندوستان سے قطع تعلق کرکے ولایت جاتے ہیں۔ وہاں وہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوگئے ہیں وہ ۲۵؍ کو لاہور والوں سے رخصت ہوکر ۲۶؍ کو علی گڑھ پہنچ جائیں گے۔ وہاں ان کی رخصت کا ایک شاندار جلسہ کیا جائے گا۔ دو روز وہاں ٹھیر کر وہ ولایت کو روانہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ مجھے کھانسی زکام نے ابھی تک نہیں چھوڑا اور اس موسم میں سفر کرنا ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر اس موقع پر جانا ضرور ہے۔" پھر ۹؍اپریل ۱۹۰۴ء کے خط سے (ص ۲۵۶) معلوم ہوتا ہے کہ ۸؍اپریل کو آٹھ دن کے قیام کے بعد لاہور سے واپسی ہوئی۔ وہاں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں گئے تھے جہاں دو برس سے تقاضا ہو رہا تھا

پیسہ اخبار کے ایک نوٹ پر اظہارِ خیال:

سنہ ۱۹۰۴ء کے ابتدائی ربع میں مذکورہ بالا مصروفیات کی وجہ سے ادبی انہماک سے متعلق کوئی خاص چیز نہیں ملتی۔ البتہ پیسہ اخبار لاہور میں ۱۶؍اپریل کو ایک نوٹ

قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار" شائع ہوا تو اس پر مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ ایسے جلسوں میں نظموں کی ابتدا خود جلسوں کے بانیوں کی طرف سے ہوئی ہوگی جو قدیم طرز کے مشاعروں کے کم ہو جانے کی وجہ سے ایسے موقعوں پر ہی اپنی نظمیں سنانے کو غنیمت جاننے لگے ہیں۔ آگے چل کر بتایا ہے کہ "نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے کہیں کہیں مسلمانوں کے تنزل کا رونا رو دیا ہے اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ حالانکہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع و ناپیدا کنار میدان موجود ہے" "قومی جلسوں میں مقتضائے مقام کے مطابق نظمیں پڑھنے کا دستور یہاں مسلمان قوم ہی میں ہے ورنہ یورپ میں اور خود ہمارے ملک میں کہیں ایسا دستور نہیں ہے۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آریہ سماج اور سناتن دھرمیوں کے جلسوں میں بھی سوائے بھجن گانے کے جو مذہبی خیالات پر نہایت عمدہ اثر رکھتے ہیں نظمیں پڑھے جانے کا دستور نہیں ہے۔"

دو مضمون:

اس مضمون میں کوئی خاص بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ نیچرل مضامین پر نظمیں لکھنے کے لیے شعراء کو ترغیب دی گئی ہے اور قومی جلسوں میں غلط قسم کی نظموں کو کم کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سال اور بھی دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے تھے جن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یعنی خواجہ غلام الحسنین کے ترجمہ "قوانین دولت" پر جس طرح ۱۹۰۲ء[۱] میں ایک مختصر تبصرہ کیا تھا اسی طرح ان کے دوسرے ترجمے پر تبصرہ ہے۔ یعنی ہربرٹ اسپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا اردو ترجمہ جو خواجہ موصوف

۱؎ ص ۱۹۱ کا حاشیہ دیکھیے۔

نے "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے انجمن ترقی اردو کے لیے کیا تھا اس پر بہت مختصر تبصرہ ہے۔ یہ ایک جملہ اس تبصرے کا خلاصہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ:۔

"انھوں نے ترجمے کی تکمیل اور زبان کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن کی امیدوں سے بمراتب بڑھ کر عرق ریزی و جانفشانی کی ہے۔"

شررؔ کے رسالے پر تبصرہ:

اسی زمانے میں مولوی عبد الحلیم شررؔ نے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے لیے ایک رسالہ "اتحاد" لکھنؤ سے جاری کیا تھا اس کے متعلق صرف ایک جملہ یادگار ہے کہ:۔

"جس مقصد کے لیے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کو میں ایسا ضروری اور اہم جانتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے حق میں اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔"

۳۱ مئی ۱۹۰۴ء کے خط میں (مکتوبات دل ص۲۲) مولوی عبدالرحیم خاں بسمل کو پانی پت سے لکھتے ہیں کہ "مخدومی! آپ کی غزلیں دیکھ کر ایک غزل میں نے بھی لکھی ہے۔ فصیح الملک (داغ) کی ایک غزل ابھی دیکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے:۔

کب تک چھپے رہو گے، کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے، کس کی بنی رہے گی

مگر جب فکر کرنے لگا تو اس کی بحر یاد نہ رہی...... آپ کے مشغلے کے لیے غزل مذکور ارسالِ خدمت کرتا ہوں:۔

ایک مرصع غزل:

نہ عیشِ کیخسروی رہے گا، نہ دولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گئے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے، نہ اب تمھاری بنی رہے گی

گرایا تورانیوں کو تو نے، پچھاڑا ما زندرانیوں کو
کہاں تلک اے شرابِ غفلت یہ تیری مردافگنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن[1]
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

کرے گی کچھ عقل رہنمائی نہ علم سے ہو گی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہی ہمیشہ سنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر بننے والے
یہ جنگ وہ ہے جو مسیح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا، جو چاہو مقبولِ عام ہونا
رہو گے گر حسنِ ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

جو چھوڑے میراث کچھ رہ آئی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہے گی

. . . .

---

[1] یونیورسٹی بل کی طرف اشارہ ہے۔

"شمس العلما" کا خطاب:

اس کے بعد مولانا کو یکم جولائی ۱۹۰۴ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے "شمس العلما" کا خطاب[1] ملا۔ ایک خط میں ۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو (مکتوبات اوّل ص ۱۹۲) خود لکھتے ہیں کہ "گورنمنٹ ہند نے سال گرہ کے موقع پر اب کی دفعہ مجھے بھی شمس العلما کا خطاب عنایت فرمایا ہے" جس کی سند ۲ اکتوبر کو ملی (مکتوبات دوم ص ۳۶۶) پھر ۱۹۰۴ء میں کوئی اور نمایاں چیز ان کی زندگی میں نہیں ملتی۔ البتہ عبدالولی کی علالت سے (مکتوبات دوم ص ۳۶۴) وہ بہت پریشان تھے جو پانچ سال سے صرع میں مبتلا تھے اور ۲۲ نومبر ۱۹۰۴ء کے خط (مکتوبات اوّل ص ۲۵) سے لے کر ۲۷ جولائی ۱۹۰۶ء تک کے خطوط میں ان کا مسلسل ذکر آتا ہے (صفحات ۵۶، ۶۳، ۱۱۲، ۱۹۳، ۱۹۶، ۱۹۷ وغیرہ)

۱۹۰۵ء

داماد کا انتقال:

۱۰ فروری ۱۹۰۵ء کے خط میں ۳ ماہ سے عوارضِ نزلہ میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے

---

[1] (مکتوبات دوم ص ۲۶) میں ہے "خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوا ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائرکٹر صاحب کے دربار تاج پوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیونکہ انھوں نے ڈائرکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اسی زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائرکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا۔ . . . " لیکن خود مولانا کو یہ خطاب زیادہ پسند نہ تھا کیونکہ اب افسروں سے ملنا پڑنے لگا۔ اسی خط میں اس کی تفصیل ہے۔

اور عبدالولی کی بیماری کا حال بھی ہے۔ اور ۷ اپریل ۱۹۰۵ء کے خط میں (صفحہ ۱۹۳) لکھتے ہیں کہ "عبدالولی کا پھر وہی حال ہو گیا جیسا ابتدا میں تھا۔ اس کے باپ کا ۲۰-۲۲ روز ہوئے انتقال ہو گیا۔" نواسے کی بیماری۔ پھر داماد کا انتقال کتنا روح فرسا ہو گا۔ ان کے علاوہ خود ان کی بیماریاں اور ۶۸ برس کا سن، عذاب جان ہو گیا ہو گا۔ لیکن صبر و تحمل کا زبردست مادہ تھا اور وہ اپنے حالات سے زیادہ متاثر نہ ہوتے تھے

سودیشی تحریک، اور ایک رباعی:

اسی زمانے میں سودیشی تحریک بھی شروع ہوئی تھی۔ اس کے متعلق بعد میں دیانرائن نگم (ایڈیٹر رسالہ "زمانہ" کانپور) نے مولانا سے سوالات کیے تھے (جن کا ذکر بعد میں آئے گا) مولانا یہ کہتے تھے کہ یہ تحریک اچھی ہے لیکن اسے بنگال کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے بلکہ علٰحدہ اور مستقل طریقے پر چلانا چاہیے تاکہ ملک کی دولت باہر نہ جانے پائے اور لوگوں کے دلوں میں ملکی مصنوعات کی قدر پیدا ہو۔ اس تحریک کے مؤید تلک، بپن چند پال اور کھاپرڈے بن گئے تھے۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں سے ہٹ کر ایک انقلابی ہندو جماعت تیار کر لی تھی۔ بہر حال جہاں تک ملکی مصنوعات کا تعلق تھا اس تحریک سے مسلمانوں کو بھی انکار نہیں تھا۔ مولانا حالی نے غالباً ۲ مارچ ۱۹۰۵ء سے کچھ پہلے کے لکھے ہوئے ایک خط میں (مکتوبات اول صفحہ ۲۷) سودیشی تحریک کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنی اس رباعی پر عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے:-

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکرِ انجام کا یہ
بس حبّ وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

مارلیسن کے لیے الوداعی نظم:

مکتوبات (دوم صفحہ ۲۴۷-۲۶۳ اور اول صفحہ ۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۱۹۰۵ء میں تھیوڈور مارلیسن جو ۱۸۸۹ء سے علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں تھے اور ۱۸۹۹ء سے مسٹر بیک کے انتقال پر وہاں پرنسپل ہو گئے تھے اب یہ چاہتے تھے کہ اپنے وطن جانے سے پہلے مسٹر کارنا[1] کو پرنسپل بنوا دیں۔ نواب وقار الملک اور مولانا حالی وغیرہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال جب وہ جانے لگے تو مولانا نے ایک الوداعی نظم بائیس شعر کی پڑھی جو اس طرح شروع ہوتی ہے:-

ہم سے ہوتے ہیں جدا اب آنریبل مارلیسن[2]
چھینتا ہے ان کو ہم سے جذبۂ حبِ وطن

بعض اشعار حکمتِ عملی کی خاطر بھی لکھے تھے گو کہ ممدوح کی خدمات ضرور قابلِ قدر تھیں۔

جیسے پھیلایا مقدس پال نے دینِ مسیح
آپ نے اور بک نے پھیلایا ہے ہتیا۔ کا مشن
مارسن اور مارسن بیگم نے ثابت کر دیا
خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب دو من

ایک مرض:

پھر مکتوبات (دوم صفحہ ۲۷۰-۲۷۳) میں مولانا کے ایک نئی قسم کے مرض کی ابتدا

---

[1] مسٹر کارنا کے سلسلے میں نواب وقار الملک کا ایک طویل خط مولانا حالی کے نام "مکاتیبِ محسن الملک وقار الملک" (مطبوعہ آگرہ صفحہ ۹۵-۱۰۷) میں ملتا ہے۔

[2] مکتوبات (دوم صفحہ ۲۷۰) میں لکھتے ہیں کہ "میں نے جو الوداعی نظم لکھ کر ان کو دی تھی اس سے میاں بیوی دونوں کے دل پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مارلیسن صاحب آبدیدہ ہو گئے تھے اور دونوں شکریے کے اظہار میں بچھے جاتے تھے۔"

کا حال معلوم ہوتا ہے۔ پسلی، کمر، بازو میں سخت درد تھا۔ پھر بھی کام کرتے رہے۔ وکٹوریا میموریل لائبریری پانی پت[1] (جس کو پانی پت کے لوگوں نے وکٹوریہ کی یادگار قائم کرنے کے خیال سے چندہ جمع کر کے تیار کیا تھا) مولانا حالی کے زیرِ نگرانی تھی اور وہ اس کے سیکرٹری تھے۔ لیکن بعد میں وہ سید ظفر علی اور غلام الحسنین کو سیکرٹری اور اسسٹنٹ سیکرٹری بنانا چاہتے تھے (ص ۳۷۲) ڈپٹی کمشنر اس کے پیٹرن بننے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن وہ خود مولانا کو اپنا مددگار بنانا چاہتے تھے۔

۱۹۰۶ء

حیدرآباد کا سفر:

اس کے بعد دسمبر میں کچھ طبیعت سنبھل گئی اور آخر دسمبر ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد (دکن) روانہ ہوئے۔ وہاں نظام کلب[2] میں قیام کیا۔ ۸ جنوری ۱۹۰۶ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ "میری حالت اب بعنایتِ الٰہی بہت اچھی ہے البتہ ابھی تک بھوک نہیں لگتی ....

---

[1] اسی کے متعلق مولانا کی ایک تقریر مقالاتِ حالی حصہ دوم صفحہ ۹۲ میں موجود ہے۔ مکتوبات دوم ص ۳۸ میں لائبریری کا حال ہے۔

[2] مولانا عبدالحق نے رسالۂ اردو (جولائی ۱۹۳۵ء ص ۲۳۴) میں لکھا ہے کہ "اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی کی تقریب میں جب مولانا حالی کا حیدرآباد آنا ہوا تو علی گڑھ کالج کے چند قدیم طالب علموں نے نظام کلب میں مولانا کے اعزاز میں ایک دعوت دی ..... نواب عماد الملک نے ایک نئی اور عجیب بات کہی کہ ہماری زبان نثر تھی ہی نہیں، مولانا حالی نے سب سے پہلے متین اور سنجیدہ نثر کی بنیاد ڈالی۔"

ہیں اور میرے سب ہمراہی بطور سرکاری مہمانوں کے یہاں مقیم ہیں۔ گاڑی اور کھانے وغیرہ کے خرچ کا اندازہ بیس ۲۰ روپے روزانہ ہے ... مدار المہام بہادر توقع سے زیادہ عنایت کے ساتھ ملے۔ نہایت خلیق، سادہ مزاج اور لیاقت کے لحاظ سے یہاں کے امراء میں مستثنیٰ ہیں۔ مجھے یہاں حضور[۱] کے جشن چھپنی سالہ سالگرہ کی روئیداد لکھنے کے لیئے بلایا گیا ہے جس میں کسی قدر حضور کے خاندان کا حال، نیز ان کے عہد حکومت کے بڑے بڑے کام بھی درج ہوں گے۔ ابھی اس کے لیے میٹریل جمع کیا جا رہا ہے، مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے اور ایک کاتب میری مدد کے لیے مجھے ملے ہیں (ص ۳۰۶)

پھر ۱۱ فروری ۱۹۰۶ء کے خط میں (ص ۳۰۷) وہیں سے لکھتے ہیں کہ یہاں چند واقع ایسے پیش آئے کہ مدار المہام بہادر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرنس آف ویلز کی تشریف آوری کے علاوہ حضور نظام کی صاحبزادی کا جس کو وہ اپنی تمام اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور ۲۲ برس کی عمر تھی، انتقال ہوگیا۔ اس حادثے سے پرنس کے آنے کی خوشی بھی غم سے بدل گئی۔ مگر امید ہے کہ جلد اجازت مل جائے گی۔" بہرحال، ۲ جون ۱۹۰۶ء کو کو حیدر آباد سے روانہ ہوئے اور ۱۲ جون کو پانی پت پہنچ گئے۔ لیکن حیدر آباد کے قیام کے دوران میں ان کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔ ۱۶ جون کے خط میں (ص ۳۰۹) لکھتے ہیں کہ:-

"میں حیدر آباد سے تندرست نہیں آیا۔ دائیں آنکھ میں پانی اترتا معلوم ہوتا ہے اس میں برائے نام روشنی باقی رہ گئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ ٹانگیں چلتے وقت لڑکھڑاتی ہیں۔ بائیں ہاتھ میں تقریباً بیس روز سے بہت سخت درد رہتا ہے۔"

۱؎ اس موقع پر قصیدہ لکھنے کے لیے مدار المہام کی طرف سے اشارہ ہوا تھا اس کے لیے صحیح واقعات معلوم کرنا چاہتے تھے تاکہ غلطی نہ کی جائے۔ ملاحظہ ہو مکتوبات دل ص ۵۹۔

سر سید پر مضمون:

قیامِ حیدرآباد کے دوران میں سر سید مرحوم کی برسی کے موقع پر یعنی ۲۷ مارچ[1] سنہ ۱۹۰۶ء میں ایک طویل مضمون سر سید پر لکھا تھا جس میں ان کے بڑے بڑے کارناموں اور واقعات کا ذکر ہے اور آخر میں ان کے متعلق مرثیے کے ایک بند کے اشعار پیش کیے ہیں جو اس طرح شروع ہوتے ہیں:-

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن — در فصاحت ہمچو سحباں در خرد لقماں شدن

چپ کی داد:

اسی قیام کے زمانے میں مولانا کی مشہور نظم "چپ کی داد" بھی لکھی گئی جب[2] انھوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں جس کے صدر مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد تھے سنائی۔ یہ نظم عورتوں کے فضائل اور فرائضِ منصبی سے متعلق ہے۔ ان کی ہمدردی، وفا، عصمت و عفت، صبر و استقلال، خدمت گذاری اور جفاکشی کا حال ہے۔ ان کے حقوق کی حمایت کی ہے اور تعلیم سے محروم رکھنے کی مخالفت کی ہے۔ اسی کے متعلق وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک مضمون "ہماری معاشرت کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے" میں بھی لکھ چکے تھے۔

---

[1] مقالاتِ حالی (حصہ دوم صفحہ ۲۱۳) میں اس مضمون کے تعارف سے اس کا سال سنہ ۱۹۰۵ء ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء ہی ہوگا۔ کیونکہ دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء کے آخر میں مولانا حیدرآباد گئے تھے اور مضمون میں بھی مولانا نے کہا ہے کہ ان کی وفات کو آج پورے آٹھ برس گذرے ہیں۔

[2] بحوالہ سکینا۔ حامد حسن قادری صاحب نے داستان تاریخ اردو (صفحہ ۵۶۶) میں اس نظم کا سالِ تصنیف سنہ ۱۹۰۵ء لکھا ہے۔

کہ عورتوں کو زمانہ حال کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ فضول رسمیں باقی نہ رہیں۔ اس نظم میں کہتے ہیں :-

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دُنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی غیرت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دُکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس، جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

اس میں آٹھ بند ہیں پہلے اور دوسرے بند میں نو نو شعر تیسرے میں دس چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں میں پھر نو نو شعر اور آٹھویں بند میں صرف تین شعر ہیں، پانچویں بند کے چند شعر عورت کی بے بسی کی پُر سوز داستان ہیں :-

اکثر تمھارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوحِ ہستی سے مٹا

گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمھارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خدا

زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا

بیاہی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے تاگے سے بندھا

بیاہا تمھیں ماں باپ نے ایسے بے زبانو اس طرح
جیسے کسی تقصیر پہ مجرم کو دیتے ہیں سزا

گزری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا

عورتوں پر معاشرے کے مظالم جس سوز و گداز کے ساتھ بیان کیے ہیں اس سے دل ہل جاتے ہیں اور ہم حالی کے ہم زبان ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:۔

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

اس نظم کا جواب بھی اردو تو کیا مشرق کی زبانوں میں بھی مشکل مل سکے گا اور یہ بھی حالی کے ان شاہکاروں میں سے ہے جن کا ایک ایک پارہ ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔

حیدر آباد سے مولانا ۱۳ جون ۱۹۰۶ء کو پانی پت پہنچے، لیکن اس سے قبل رسالہ "زمانہ" کانپور (بابت اپریل ۱۹۰۶ء) میں "سودیشی تحریک" کے متعلق رسالے کے ایڈیٹر کے جواب میں مولانا نے اظہارِ خیال کیا تھا کہ یہ تحریک، ملک کے حق میں بہت مفید ہے لیکن اسے تقسیمِ بنگال کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہو اور ملک کی دولت

جس راستے سے باہر چل جا رہی ہے اس راستے کو فوراً بند کرنا چاہیے لیکن اس کے لیے "جلدی کرنا" نیچر سے مقابلہ کرنا ہے۔ ع ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں۔ اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان، غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کی بہت جلد کامیابی ہوئی۔"

ال نامہ:

۲۹ اگست ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں (مکتوبات جلد اوّل صفحہ ۹۶) مولانا کے ایک "آل نامہ فارسی" کا ذکر ہے جس میں ہر فرقے اور ہر گروہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ مولانا کے رجحانات اور ذہنی کیفیات کے سمجھنے کے لیے یہ آل نامہ بہت ضروری ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:-

۱- المذہب = اعلانِ جنگ۔

۲- الدین = تقلیدِ آباؤ اجداد۔

۳- العلم = قسمے از جہلِ مرکب۔

۴- الامتحان = آزمائش لیاقت ممتحناں۔

۵- الیونیورسٹی = کارخانۂ کلرک سازی۔

۶- المسلمانانِ ہند = چوں مار گزیدہ از ریسماں ترسندگاں۔

۷- العلی گڑھ پارٹی = شہیدِ وفا۔

۸- العلی گڑھ کالج = پرورش گاہِ طفلاں بدست مائنداں۔

۹- الانجمن ہائے اسلامیہ = سبزۂ برشگال۔

۱۰- الاتفاق در مسلماناں = چوں اجتماع در نقیضین۔

۱۱- الرئیس = آنکہ از ریاست بے خبر باشد۔

۱۲- الامیر = آنکہ تہی دست و قرض دار باشد۔

۱۳- المولوی = آنکہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد۔

۱۴- الواعظ = آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند۔

۱۵- الشکار = بہانۂ آدم کشی۔

۱۶- الکمیشن = وجہ موجہ برائے فیصلۂ یک طرفہ۔

۱۷- انیشنل کانگرس = در حقِ تعلیمِ ہند چوں بغاوت ۵۷ء و در حق اسلوۂ اہلِ ہند۔

یہ پچاس ساٹھ جملے تھے جو شاید مولانا کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے۔ ورنہ مولانا پہ کچھ مزید لے دے ہوتی اور ممکن ہے کہ قوم کچھ گالیاں لکھ کر بھی تحفۂ عقیدت پیش کرتی۔ کیونکہ اس سے نہ صرف مولانا کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے رجحانات پر طنز آمیز تبصرہ بھی ہے اور انھوں نے کچھ ایسی گہری چٹکیاں بھری ہیں جو بیل منڈھے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

اس کے بعد آنکھوں میں موتیابند کی تکلیف کی وجہ سے (مکتوبات اول ص ۹۶) مولانا لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا اور بعض حالات انھیں لکھنے پر مجبور بھی کر دیتے تھے۔ مثلاً والیِ افغانستان کی آمد پر باوجود کھانسی زکام اور دیگر شکایتوں کے انھیں قصیدہ لکھنا پڑا۔

۱۹۰۷ء

امیر کے لیے فارسی قصیدہ اور عرضداشت:

والیِ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے اور عید الفطر ۱۳۲۴ھ (جمعہ، ۷ر نومبر) کی نماز دہلی میں پڑھی۔ جنوری ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ بھی گئے۔ مولانا اپنے ۲۷ر جنوری والے خط میں (مکتوبات۔ دوم ص۲۸۷) لکھتے ہیں "مجھے نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی آمد کے موقع پر نہایت تقاضے کے ساتھ علی گڑھ بلایا تھا اور کچھ فارسی اشعار بطور شکریے کے لکھنے کی فرمائش بھی کی تھی ——— میں اور مولوی وحید الدین (سلیم) پندرھویں کی رات کو پونے دس بجے کی میل سے روانہ ہو گئے ——— گاڑی وہاں تین بجے رات کو پہنچی۔ امیر صاحب کے ہمراہیوں کے علاوہ تقریباً آٹھ سو مہمان —— فرد کش تھے ——— انھوں نے (نواب محسن الملک نے) مجھے یہ خدمت بھی سپرد کی ہے کہ ایک آرٹکل فارسی زبان میں امیر کی تشریف آوری کالج کے متعلق لکھ کر کسی اخبار میں شائع کراؤں اور وہ پرچہ امیر کی نظر سے گذر جائے[1]"۔ اس موقع پر امیر کے سامنے جو قصیدہ مولانا نے پیش کیا تھا وہ

---

[1] مکتوبات دوم صفحہ ۸۷۔ ۱۸۱ مولانا چاہتے تھے کہ امیر پر یہ بات ظاہر ہو کہ مولانا کی کتابوں سے مسلمانانِ ہندوستان میں تعلیم اور ترقی کی بہت بڑی تحریک پیدا ہوئی ہے" (ص۷۹) اور یہ کہ "ایشیائی شاعری جو محض ایک بے کار چیز تھی اس کو مفید بنایا گیا ہے" (ص۸۲) امیر کے لیے عرضداشت فارسی میں ۱۷ر فروری ۱۹۰۷ء تک لکھ لی ہو گی (ص۸۲) جس میں مولانا کی ہر ایک کتاب کا مختصر حال بھی تھا۔

صرف انیس[19] اشعار کا تھا۔ جو اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

می رسد گر فرقِ عزت بگذرد از فرقداں
میزبانے را کہ شاہے چوں تو باشد میہماں

گر برقص آید در و دیوارِ کالج دور نیست
زیں طرب کامد بدیدارش امیرِ کامراں

دولتِ بیدار مفتِ ماکہ شد مہمانِ ما
چوں تو مہمانِ عزیزِ قیصرِ ہندوستاں

زندہ کاش امروز بودے بانیِ ایں درسگاہ
تا بدیدے پایہ اش بالاتر از وہم و گماں

تا ہمہ امید ہا کاندر دلِ خود بستہ بود
از قدوم شہ بچشمِ خویشتن دیدے عیاں

اس قصیدے میں کالج کی تعلیمی خدمات کا مختصر جائزہ اور حکومت کی امداد کا حال ہے۔ اصل مدح مشکل سے ملتی ہے اور جو کچھ ہے وہ اس طرح ہے :۔

ملّتِ افغاں ز تدبیرِ تو اندر علم و فن
گوئے سبقت بردہ باد از جملہ ابنائے زماں

غرض کہ اس طرح کے دعائیہ پر تین شعر کے بعد قصیدہ ختم کر دیا ہے۔ اس زمانے میں مولانا بیمار بھی تھے جیسا کہ ایک خط سے (مکتوبات دوم صفحہ ۳۸) ظاہر ہوتا ہے اور کھانسی زکام کی بڑی شدید تکلیف تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں جیسی آتی بھی

تھی اس لیے ان کے ابتدائی قصیدے بھی (سوائے حکمتِ عملی کی غرض والے) اس چیز سے خالی ہیں۔

مذہبی مناظرے:

اسی زمانے میں مولانا نے ایک مضمون "موجودہ مذہبی مناظرے" لکھا جو رسالہ "عصرِ جدید" (میرٹھ) بابت مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے مولانا نے امام غزالی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "مناظرے سے چند کمینہ خصلتیں خواص علما میں پیدا ہو جاتی ہیں جیسے حسد، تکبر، غیبت، خود پسندی، عیب جوئی، شماتت، نفاق، حق بات سے انکار اور باطل پر اصرار وغیرہ وغیرہ۔ اور سفلا و جہلا میں اکثر گالی گلوچ اور جوتی پیزار تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔" مولانا نے لکھا ہے کہ "یہ چیز بڑھ کر وبائے عام کی طرح پھیل جاتی ہے اور قوم میں جلد جلد دھڑے اور فریق بن جاتے ہیں۔" آگے چل کر ان کتابوں کا ذکر ہے جو شیعہ سنیوں کے جھگڑوں سے متعلق ہیں۔ پھر سمجھایا ہے کہ ان جھگڑوں کو چھوڑ کر "مغربی تعلیم جو اندر ہی اندر مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے اس کے مضر نتائج سے قوم کے نوجوانوں کو بچائیں اور (موجودہ مسیحی مبلغین کی طرح) اپنے ہتھیاروں کو ملحدوں اور دہریوں کے مقابلے میں استعمال کریں۔" آخر میں مولانا "ایک شاعر (یعنی خود حالی) کے چار مصرعے (رباعی) نقل کرتے ہیں":-

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر　　کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر؟
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ　　کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

اس رباعی سے مولانا نے بڑی غیرت دلائی ہے۔ کاش ہم کو غیرت آتی؟

رُباعیاں:

مکتوبات (حصہ اول ص ۵۰) میں ۲۵ فروری ۱۹۰۷ء[1] والے خط میں بیس رباعیوں کا ذکر ہے جو انھوں نے دیوان کے نئے ایڈیشن میں داخل کرائی تھیں۔ ان میں سے ایک رباعی جو "خدا کی بے نیازی پر نہایت پیچ و تاب کی حالت میں لکھی تھی" یہ ہے:-

منوائی ہے ہار سب بازی نے تری — طبقے الٹے ہیں ترک تازی نے تری
ہے کال وری[2] و کربلا اس پہ گواہ — جو گھر گھالے ہیں بے نیازی نے تری

۲۷ مارچ ۱۹۰۷ء والے خط میں ذکر ہے کہ نواب محسن الملک نے علی گڑھ سے استعفیٰ دے دیا (مکتوبات اول ص ۵۱) اور ۷ مئی والے خط سے (دوم ص ۳۹۷) معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نواب صاحب سخت علیل تھے۔ اسی خط میں مولوی عبداللہ خاں کے نام "پروکسی" (ووٹ معتمدی کے لیے) روانہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اور یہ خط پٹیالہ سے لکھا ہے جہاں وہ اپنی آنکھ بنوانے گئے تھے۔ وہاں سے آنکھ[3] بنوا کر ۱۸ مئی کو پانی پت واپس آ گئے

---

[1] ۱۸ مارچ کے خط میں ذکر ہے (ص ۳۹۵ حصہ دوم) کہ وحیدالدین (سلیم) کو نواب محسن الملک نے ایک سو کی تنخواہ پر رکھ لیا ہے اور ۱۲ مارچ والے خط میں (ص ۳۹۴) لکھا ہے کہ دوسری آنکھ کی روشنی بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔

[2] "کال وری" وہ مقام جہاں عیسیٰ علیہ السلام کو سُولی پر چڑھانا مشہور ہے۔

[3] لیکن کلکتے سے اچھی عینک ۱۰ اگست ۱۹۰۷ء تک (دوم ص ۴۰۳) نہیں آئی پہلے جو وہاں سے آئی تھی (دوم ص ۴۰۴) وہ ٹھیک نہیں لگی تھی۔ دوبارہ آئی وہ بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ۲۸ اگست کے خط میں (ص ۴۰۵) ذکر ہے کہ کلکتے سے دو عینکیں آئی تھیں۔ دونوں آنکھ پر نہیں لگیں۔ اس لیے ۱۰ ستمبر (ص ۴۰۶) کو پھر پٹیالہ جانے کا ارادہ تھا۔

(اول ص۲۳)، لیکن دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے۔ آنکھ بند ہونے سے کچھ پہلے (اول ص۳۵) پانچ رباعیاں لکھی تھیں:۔

۱ - پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف
حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف
گر غور سے سنیے عمل ہے یہ چار طرف
انصاف، انصاف، آہ انصاف، انصاف

۲ - اُترو دریا سے اپنے بل تیر کے پار
کب تک تیرو گے ہو کے تو بنوں پر سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں
اوروں کا سہارا تکنے والو ہشیار

۳ - بڑھتا جاتا ہے جس قدر علمِ بشر
کرتے جاتے ہیں شک خیالات میں گھر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی ہی فضا
جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

۴ - یا نفس کی خواہشوں کو روک اے زردار
یا فاقہ و فقر کے لیے رہ تیار
لاگے ہوئے ہیں چار طرف گھات میں چور
گھر سے ہشیار، مال و زر سے ہشیار

۵ - پیری میں نہ عقل چین لینے دیتی   کرتا رہتا نہ دل کو گر نفس قوی

کہتا ہے یہ جب موت کا آتا ہے خیال   بابا کے آمدی و کے پیرسٹ ری

اور ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء کو مولانا شبلی کے پاؤں کے حادثے پر حالی نے یہ رباعی لکھی :-

شبلی کہ گزند پاش پردل شکن است   با خستگیش خستگی مقترن است

چندانکہ بکاہند فزایند ایں جا   "کآراستنِ چمن زپیراستن است"[1]

۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کے خط میں (مکتوبات - اول ص ۔) مولانا عبدالحق کو نصیحت کی ہے کہ برٹش فارن پالیسی پر نوک جھونک نہ کریں کیونکہ یہ خلافِ مصلحت ہے۔ مولانا حالی نے راست گوئی کی تعریف ضرور کی ہے لیکن حکمتِ عملی یہاں بھی سکھائی ہے۔

محسن الملک کا انتقال :

۳۱ اکتوبر کو بریلی سے لکھتے ہیں کہ (دوم ص ۴۱) "نواب وقار الملک یہاں آئے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر ٹرسٹیوں کی کثرت رائے میری نسبت ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی مجھ پر اعتماد کیا تو میں کالج کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ گذشتہ[2] اتوار کو یہاں ایک عظیم الشان جلسہ نواب (محسن الملک) مرحوم کے ماتم پر ہوا انقلاب کارروائی جلسہ کے ایک ریزولیوشن بہ اتفاق تمام حاضرین جلسہ اس مضمون کا پاس کیا گیا کہ بجائے مرحوم کے نواب وقار الملک آنریری سیکرٹری مقرر کیے جائیں محسن الملک کی یادگار کے لیے چندہ بھی کچھ اوپر چھ سو روپے کا ہوا اور ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے۔"

---

[1] ۱۶ اکتوبر کو محسن الملک کا انتقال شملہ میں ہوا تھا اور نعش علی گڑھ لائی گئی تھی۔

[2] رباعی کا چوتھا مصرع عنصری کا ہے اسی سے متعلق واقعہ نظامی عروضی کے چہار مقالہ (مقالہ دوم) میں دیکھیں

کراچی میں خطبہ، اور ایک رُباعی:

۲۵ نومبر ۱۹۰۷ء کے خط میں (دوم ص ۲۱۰) بریلی ہی سے لکھتے ہیں کہ "لوکل کمیٹی کراچی اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علی گڑھ نے غلطی سے اجلاس کراچی میں مجھے پریسیڈنٹ بنانا تجویز کیا ہے۔ ہر چند عذرات کیے گئے مگر مجھے اس قدر مجبور کیا کہ انکار کرنے کا محل باقی نہ رہا۔ اس لیے علی گڑھ جا کر چند روز قیام کرنا اور پریسیڈنشل ایڈریس تیار کرنا پڑے گا جو میرے لیے ایک بالکل نیا اور نہایت دشوار کام ہے۔" چنانچہ (ص ۲۱۲) علی گڑھ جا کر خطبۂ صدارت تیار کرنا پڑا اور لکھا ہے کہ "یہاں سے غالباً بیس آدمی لڑرووڈ گاڑیوں میں ۲۱ دسمبر کو روانہ ہوں گے۔ مولوی وحید الدین صاحب بھی ساتھ چلیں گے۔" چنانچہ ۲۳ دسمبر کو آٹھ بجے رات کراچی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اور وہاں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کے اکیسویں سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت پڑھا۔ اس خطبے میں ۱۸۸۶ء سے کانفرنس کا قیام، سرسید اور محسن الملک کی خدمات وغیرہ کا شروع میں ذکر ہے۔

اس سلسلے میں مولانا کا تازہ کلام بھی ہے۔ ایک رباعی یہ ہے:۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر — غل علم کا برہما میں مچایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی — واں آبِ حیات ان کو پلایا جا کر

محسن الملک کا غم:

پھر محسن الملک کا مرثیہ ہے:۔

جس وقت کا کھٹکا تھا وہی آ گیا آخر — یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر

وُہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار ۔۔۔ سر گرکے تھم قوم کی کام آگیا آخر

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا ۔۔۔ اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

اس مرثیے میں صرف نو شعر ہیں لیکن حقیقت نگاری اور جذبات نگاری جن مختصر الفاظ میں کی ہے اس کی مثالیں بہت کم ہماری زبان میں ملتی ہیں :-

جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھے کیا کیا

پر مر کے خلوص اپنا وُہ منوا گیا آخر

جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اس کے

وُہ خون کے آنسو انھیں رُلوا گیا آخر

مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری

کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

پھر سندھ اور عرب کے تعلقات کا مختصر ذکر ہے اور یہاں کے مسلمان حکمرانوں کا ذکر ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے پہلے سندھ پر گیارہ سو برس سے زیادہ حکومت کر چکے تھے۔ چنانچہ تین چوتھائی سے زیادہ اب بھی مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اس کے باوجود تعلیمی حالت سب صوبوں سے زیادہ خراب حالت میں ہے۔ پھر کراچی، لاڑکانا، حیدر آباد، سکھر وغیرہ کے مدرسوں کا ذکر ہے جو ابھی کھلے گئے تھے۔ اسی ضمن میں سر سید کے اس انعامی اشتہار کا ذکر ہے جو انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا کہ مسلمان اپنی اولاد سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے کیوں نہیں بھیجتے اور قوم نے یہ جواب دیا تھا کہ ایسے سرکاری مدرسے اپنے طریقۂ تعلیم کو ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں بنا سکتے اس لیے اپنی تعلیم و تربیت کی فکر خود ہم کو کرنی چاہیے۔ پھر سندھ

کے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو دقتیں پیش آرہی تھیں ان کا حل پیش کیا ہے کہ مسلمان اُستاد مقرر کیے جائیں۔ مذہبی تعلیم کا انتظام خود قوم کی طرف سے کیا جائے اور قوم کے ہونہار بے استطاعت لڑکوں کو وظائف دینے کی کوشش کی جائے جس کے لیے سرسید کی تقلید ضروری ہے کہ چندہ جمع کرنے والے مہیا کیے جائیں پھر رُوسی اور مصری مسلمانوں کا ذکر ہے کہ وہ بھی علومِ جدیدہ کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ حکومت برطانیہ بھی ہمارے لیے ہماری تعلیم میں آسانیاں پیدا کر رہی ہے اور طرح طرح سے تعلیم کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ لیکن ہم کو بھی چاہیے کہ اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے تعلیم کو عام کریں۔ پھر تین بند پیش کیے ہیں جن میں مولانا حالیؔ کے دلی جذبات ہیں اور حقیقی سوز و گداز ہے :-

زمانہ دیر سے چلا آ رہا ہے اے مسلمانو
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

یہ بند اسی ترکیب بند میں سے ہیں جو مولانا نے ۱۸۹۵ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا تھا۔ پھر عام مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق فرمایا ہے اور سرسید کی تعلیمی اسکیم کا مقصد بتایا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ علی گڑھ سے فارغ ہو کر طلبہ اپنی تعلیم کی رہنمائی سے اپنی طبیعت اور حالت کے مطابق ذریعۂ معاش خود ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن طلبہ صرف ملازمت چاہتے ہیں اور آزاد پیشے اختیار کرنے سے بھاگتے ہیں۔ صنعت و حرفت، تجارت نئی قسم کی

زراعت وغیرہ میں بہت برکت ہے اور سودیشی تحریک کو حکومت بھی تسلیم کر رہی ہے۔ چنانچہ ان چیزوں پر نظر رکھنی اور تعلیم کے ہر شعبے میں دست گاہ حاصل کرنی چاہیے آخر میں یہ تین شعر دیے ہیں :-

جو اپنے ضعف کا کچھ کر نہیں ہیں تدارک — قومیں وہ چند روزہ دنیا میں مہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے — دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں
سنبھلو دگر نہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا — بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں[1]

یہ خطبہ نہ صرف مولانا حالی کی نثر میں بلکہ اردو خطبات میں بھی بہت اہم ہے اور فنِ خطابت میں اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں اور لطافتوں کی وجہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سرسید اور خود مولانا حالی کی خدمات اور جذبات کا خلاصہ موجود ہے اور تقریباً نصف صدی کے تعلیمی حالات کا جائزہ ہے۔

بچّی کے لیے نظم :

مولانا کے بڑے صاحبزادے اخلاق حسین کی نواسی سیدہ خاتون جو غلام الثقلین کی دختر تھی مولانا سے بہت مانوس تھی جب وہ دو سال کی تھی (یعنی ۱۹۰۰ء) تو انھوں نے انتالیس اشعار کی ایک نظم لکھی تھی (تذکرہ حالی صفحہ ۲۲۸-۲۳۱)

---

[1] مقالاتِ حالی (حصہ دوم۔ ص ۱۰۶) میں اجلاسِ کراچی کی آخری تقریر بھی موجود ہے جس میں سندھ کے مسلمانوں کی دلچسپی کا اظہار ہے کہ انھوں نے جتنی تجاویز پاس کی ہیں۔ ان میں اکثر عملی اور نتیجہ خیز ہیں جن پر گورنمنٹ کی توجہ اور قومی لیڈروں کی کوشش سے ضرور عملدرآمد ہو سکتا ہے۔

جو اس طرح شروع ہوتی ہے :-

بیٹیو دیکھو کیسی پیاری بچّی ہے — صورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اس کی صورت کو — منّی چلبلی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر سب اچھے برے کی ہے پہچان
ماں نے جو کچھ اسے سکھایا ہے — جو ادب قاعدہ بتایا ہے
وہ سبق سارے اس کو ہیں ازبر — نقش ایک ایک بات ہے دل پر

سنہ ۱۹۰۶ء

حکیم اجمل خاں کا خطاب اور قطعۂ تہنیت :

مکتوبات (دوم صد ۲۱۳) میں ایک خط ۵ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء کا ہے جو دہلی سے لکھا تھا۔ اس میں دوسرے دن پانی پت جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن مقالاتِ حالی (حصہ دوم صد ۱۱۹) کی ایک تقریر کے تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ جنوری کو دہلی کے کمپنی باغ ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ والئ لوہارو جناب نواب امیرالدین احمد خاں مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا۔ جس میں حالی بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ جلسہ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ حکیم اجمل خاں مرحوم کو یکم جنوری سنہ ۱۹۰۶ء میں "حاذق الملک" کا جو خطاب ملا تھا اس کی تہنیت پیش کی جائے۔ مولانا نے ایک مختصر تقریر کی تھی جس کے آخر میں ایک قطعہ چھ شعر کا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

حاذق الملک اس خطابِ فرخ و مسعود پر
ایک عالم آپ کو دیتا مبارک باد ہے

آخری دو شعر یہ ہیں:-

یہ تو یاروں کی دعاؤں کا ہے بس سارا ظہور
غیب سے یہ ان دعاؤں کی ہی تو امداد ہے
پس مبارک باد یہ جو دے رہے ہیں خاص و عام
مستحق ہیں اس کے ہم یا آپ، کیا ارشاد ہے

مسئلۂ خیرات پر مضمون:

اسی سال ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں "انجمن بہبود مسلمانانِ دہلی" کے سیکرٹری کی درخواست پر ایک مضمون "مسلمانوں میں مسئلہ خیرات" پر لکھا تھا۔ اس مضمون میں مختلف احادیث سے گداگری کی مذمت کی ہے اور سائل کو سوال کرنے سے روکنے کے لیے ترغیب دلائی ہے۔ موجودہ حالات میں غیر مستحق سائلوں کو دینے سے منع کیا ہے اور اس قبیح رسم کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔ آخر میں علماء سے درخواست کی ہے کہ وہ دینی تقریروں میں عوام کو اس برائی سے آگاہ کریں اور خصوصاً عورتیں احتیاط رکھیں جو تمام فقیروں کو اہل اللہ سمجھ کر ان کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اسی زمانے میں مولانا اپنی طبیعت کی خرابی سے اور کئی رشتہ داروں کے انتقال سے بھی بہت پریشان تھے۔ ۲۰ فروری ۱۹۰۸ء کے خط میں (مکتوبات دوم ص ۳۱۵) خواجہ کاظم حسین کے انتقال کی خبر ہے۔ اسی زمانے میں پانی پت میں ہیضہ کی وبا تھی (ص ۳۱۴)۔ اور ۱۶ جون ۱۹۰۸ء کے خط میں (ص ۳۱۹) ذکر ہے کہ مولانا پانچ روز سے دہلی میں ہیں اور ۱۷ جون کو "مقبول حسین داماد برادرم خواجہ فضل احمد صاحب" ریل میں

آگ لگنے سے باہر کود پڑے اور وفات پائی۔

مولانا لوتی میں صرف ایک ماہ (اول ص۸۱) رہ سکے تھے کہ سجاد حسین پانی پت پہنچ رہے تھے اس لیے مولانا کو بھی وہاں جانا پڑا۔ اس زمانے میں (۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء) مولانا بہت پریشان تھے اور کہیں تنہائی کی جگہ میں رہنا چاہتے تھے۔ اسی تاریخ کے خط میں (ص۸۲) دو شعر بھی ملتے ہیں:۔

آتا ہے ڈر یہی ہے ہم کو نظر گھر اپنا — ہو عزم دیر شاید کعبے سے پھر کر اپنا
وحشت یہ ہے کہ دل کی دکھلا گئے جوہر اپنا — قید خودی میں رہتے آتے نہیں نظر ہم

یہ دونوں شعر مولانا کی انتہائی پریشانی کا ثبوت ہیں۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء والے خط میں (ص۸۵) حیدرآباد دکن کے مشہور سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے احباب کی خیریت کے بہت زیادہ مشتاق نظر آتے ہیں۔ اور ایک متعصب ہندو کی کتاب "خاتونانِ ہند" کی وجہ سے بار بار ذہنی کوفت میں مبتلا ہوتے ہیں (ص ۸۲، ۸۸، ۹۳) اس کے علاوہ میرن صاحب کی امداد کے لیے بھی حیدرآباد بار بار لکھتے ہیں۔

دوسری بیماریوں کے علاوہ ایک عرصہ تک (ص ۴۲۰) دوران سر کی شکایت میں مبتلا رہے اور دسمبر میں (ص۴۲۳) علاج کے لیے میرٹھ گئے تھے۔

۱۹۰۹ء

اپریل ۱۹۰۹ء میں پانی پت اور لاہور وغیرہ میں سخت بارش ہو رہی تھی (ص۴۲۵) اور جون کے خط سے (ص۴۲۶) مولانا کو دو عزیزوں (خواجہ عنایت علی اور خواجہ صفدر علی)

کے انتقال کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں خواجہ غلام الثقلین[ا] سخت بیمار ہوئے۔ لیکن سنبھل گئے۔ والدہ احتشام حسین بھی ۲۳ جون (صـ ۴۲۷) کو قضا کر گئیں۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج کے سیکرٹری وغیرہ کے جھگڑے بھی کھڑے ہو گئے تھے (صـ ۴۲۹)

ان تمام پریشانیوں کے باوجود مولانا ادبی کاموں کی طرف بھی متوجہ تھے چنانچہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (بابت ۴ اگست ۱۹۰۹ء) میں مصنفات نواب عزیز جنگ بہادر پر مولانا کا تبصرہ شائع ہوا۔

اسی تبصرے میں عزیز جنگ بہادر کی کتاب "سیاقِ دکن" پر مولانا شبلی کے تبصرے کا اقتباس بھی ہے کہ "ہم نے تاریخ کے سیکڑوں ہزاروں ورق اُلٹے ہیں۔۔۔۔۔ اور گو ہم نے چند معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کر لیا ہے لیکن انصاف یہ کہ جو کچھ ڈھونڈ کر پا سکے وہ من میں چھٹانک بھی نہ تھا۔ نواب عزیز جنگ بہادر نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۶۶ صفحے کی کتاب تیار کر دی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے۔" پھر اس تبصرے میں مولانا حالی نے عزیز جنگ کی دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے اور قوم نایط پر چھ سو صفحات والی کتاب کی بہت تعریف کی ہے اور ان کے اچھوتے موضوعات اور گہری تحقیقات کی دل کھول کر داد دی ہے۔ "عطیاتِ سلطانی" میں دکن کے معاشی اداروں کا بہت تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے اور ریاست کی عام فیاضی، بے تعصبی اور انسانی ہمدردی کا نہایت محققانہ مطالعہ ہے۔ غرائب الجمل اور فارسی ڈکشنری وغیرہ کی خوبیاں بھی مولانا نے بیان کی ہیں اور ان کی اکثر تصانیف کو بہت سراہا ہے۔

[ا] ان کے علاج کے لیے حکیم اجمل خاں (صـ ۴۲۱) پانی پت گئے تھے۔

سنہ ۱۹۱۰ء

اس کے بعد مولانا کے قویٰ میں دفعتہً ایسا انحطاط ہو گیا تھا کہ لکھنا پڑھنا اور سوچنا یک قلم موقوف ہو گیا (مکتوبات ص ۱۰۲) اور عرصے تک یہی حالت رہی تاہم خط لکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ نومبر سنہ ۱۹۱۰ء[۵۱] میں جب مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب نے "خطوطِ امیر احمد مینائی" شائع کرائے تو مولانا نے اس کے لیے ایک مختصر تبصرہ بطور "پیش لفظ" کے لکھا۔ اس میں ذکر ہے کہ ثاقب نے پہلے امیر مینائی کے سوانح لکھے ہیں پھر داغ اور امیر کے کلام میں فرق قائم کیا ہے اور اس کے لیے دونوں کے پست و بلند اشعار پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد حالی لکھتے ہیں کہ "جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو اب اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔" یہ بالکل حقیقت ہے۔ کاش ہم کو مولانا

---

[۵۱] ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کے رسالہ عصمت دہلی میں ایک انعامی اعلان کے مطابق "تسخیر شوہر" مؤلف فرہنگ آصفیہ کی اہلیہ نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس پر مولانا نے بہت ہی مختصر تبصرہ کیا ہے جس میں کتاب کا مقصد بیان کر کے اس کی اصلاح کا ذکر کیا ہے جو سید احمد دہلوی نے کی تھی اور یہ کہا ہے کہ "مبتدی لڑکیوں اور لڑکوں کے حق میں یہ مختصر رسالہ نہایت مفید ہوگا۔"
۱۵ اگست سنہ ۱۹۱۰ء کے خط میں (مکاتیبِ حالی ص ۹۳) مولوی چراغ علی کی وفات پر دس اشعار کا ایک فارسی قطعہ ملتا ہے۔

حالی کی ابتدائی اور درمیانی زندگی کے خطوط بھی مل جاتے تو ان کے سوانح بھی پوری طرح معلوم ہو سکتے۔

سنہ ۱۹۱۱ء

سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی تھی حالانکہ بعض اعزہ کا انتقال (مکتوبات ص ۲۰۱/۲ و ص ۲۳۳/۲) ہو گیا تھا۔ خواجہ غلام الثقلین اسی سال کے اواسط میں (ص ۳۰۴/۱) بغداد، طہران اور کاظمین وغیرہ گئے تھے۔ ان کے حالات یکم اگست کے خط میں ملتے ہیں[۱]۔ اسی سال مولانا نے لالہ ہری رام کے "خم خانۂ جاوید" کی پہلی جلد پر تبصرہ لکھا تھا جو سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس تبصرے میں مولانا اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ "بدقسمتی سے ایسے مکروہات پیش آتے رہے کہ میں اطمینان کے ساتھ اس کی نسبت کچھ نہ لکھ سکا۔" اس تبصرے میں اردو ہندی کے جھگڑے کا ذکر کیا ہے جس کی رفع داد مولانا کے نزدیک "اسی طریق سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب، کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت، اور اس کی پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں اور . . . مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالامال کرنے کی کوشش کریں۔" مولانا نے اس قول پر خود ہی سب سے زیادہ عمل کیا اور اس کے باوجود اردو زبان کو معیاری بنانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مولانا برج بھاشا

۱۔ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء کے خط میں (مکتوبات ص ۲۲۶/۲) غلام الثقلین کی واپسی کا ذکر ہے۔

سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے بھی مشورہ دیتے ہیں اور رواداری پیدا کرنے کے لیے یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کام سے" اس عام خیال کی تردید ہوتی ہے کہ انگریزی تعلیم بجائے اس کے کہ قومی تعصبات سے دلوں کو پاک کرے اور الٹی تعصب و ناگواری کی آگ ملک میں مشتعل کرنے والی ہے۔" اس تبصرے میں رواداری قائم کرنے کی تبلیغ زیادہ ہے اور اصل کتاب پر بحث بہت کم ہے تاہم آخری پارے میں مؤلف کی بعض غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے کہ "ص ۳۳۰ پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا حال لکھا گیا ہے۔ اس میں چند فروگزاشتیں ہو گئی ہیں۔ اوّل تو شاہ صاحب ممدوح کا اردو[۱] زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے ان کا وطن سرہند اور مجدد الفِ ثانی کی نسل سے ہونا اور فیروز شاہ کوٹلہ میں سکونت پذیر ہونا غلط معلوم ہوتا ہے" مئی ۱۹۱۱ء میں آنکھیں بنوانے لکھنؤ گئے تھے (مکتوبات ص ۳۲/۲) لیکن وہاں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں کی مسند نشینی پر ایک قطعہ تہنیت انیس اشعار کا لکھا تھا جس میں ان کی اہم ذمہ داریاں بتائی ہیں اور کوئی مدحیہ اشعار نہیں ہیں:-

ملک مرتبت میر عثمان علی خاں — مبارک تمہیں مسندِ شہریاری
مبارک اب وجد کی تم کو خلافت — مبارک دکن کی تمہیں تاجداری

۱؎ شاہ صاحبؒ فارسی اشعار ضرور کہتے تھے۔ الفرقان (بریلی) کے "شاہ ولی اللہ نمبر" میں بھی کچھ اشعار ملتے ہیں۔

مبارک تجھیں ملک کی گلّہ بانی — مبارک رعیّت کی خدمت گذاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل — جہاں چپّے چپّے پہ ہے فتنہ داری
مبارک وہ منصب کہ جس کو ملا ہے — ہمارا چین فرصت فراغت ہماری

آخر میں سادہ طریقے پر دعائیہ لکھا ہے

اس کے بعد غالباً سردی شروع ہونے پر مولانا کو "زکام اور کھانسی کا حملہ ایسا سخت ہوا تھا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا" (مکتوبات ص $\frac{205}{1}$) اور مئی۔جون ۱۹۱۲ء میں کھانسی وغیرہ (ص ۲۰۷) کی شکایت تھی اور کمزوری زیادہ تھی، اس لیے جولائی میں شملہ چلے گئے تھے۔ لیکن وہاں صحت کے لیے کوئی فائدہ (ص ۲۰۷) حاصل نہیں ہوا اور روز بروز انحطاط ہونے لگا۔ پھر آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے (مکتوبات ص $\frac{247}{2}$) دہلی گئے اور وہاں اردو دیوان (دو دیوانہ) مرتب کرنے لگے۔ اکتوبر میں وہاں بلاقی بیگم کے کوچے میں ٹھہرے تھے۔ پھر فرید آباد ضلع گوڑگانوہ (دہلی) چلے گئے۔ کیونکہ دہلی میں طبیعت بگڑنے لگی تھی اور فرید آباد میں آخر دسمبر ۱۹۱۲ء تک[1] (ص $\frac{56}{2}$) ضرور رہے۔ اس کے بعد غالباً شروع جنوری ۱۹۱۳ء میں (ص $\frac{96}{1}$) پانی پت واپس ہوئے لیکن پہنچتے ہی پریشانیوں میں (ص ۹۸) مبتلا ہو گئے۔ تاہم کسی صورت سے اپنا فارسی اور عربی کلام چھپوانے کے لیے اکتوبر (ص $\frac{94}{2}$) تک تیار کر لیا تھا۔

---

[1] ۴ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں ایک پُر درد شعر لکھا ہے :۔

خدا ہی جانے سحر ہو نہ ہو جئیں نہ جئیں — شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

۱۹۱۲ء

۱۹۱۲ء میں جبکہ مولانا فرید آباد (گوڑگانوہ) میں تھے تو وہاں سے ۱۴ر اکتوبر کے خط میں (حصّہ اوّل) لکھتے ہیں کہ "ٹرکی کی خبریں جو آج کل آرہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے۔ ایران اور مراکو[1] کی تو فاتحہ خیر پڑھ چکے تھے۔ اب ٹرکی کی بھی ابتک خیر نہیں معلوم ہوتی۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔" بات یہ تھی کہ اس زمانے میں یورپ کی بڑی طاقتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں (بلغاریہ، سربیہ، یونان، مان ٹی نگرو) نے ٹرکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کردیا تھا۔ اور مقدونیہ چھین لینے کا ارادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ایک طویل محاصرے کے بعد ادرنہ[2] چھین بھی لیا تھا۔ مولانا حالی کا ایک قطعہ اسی سے متعلق ہے، اور ان کے دیوان میں موجود ہے:۔

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
گھٹتے جاتے ہیں زور مند ضعیف — بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

۱؎ مولانا شبلی نے اسی موقع پر "شہر آشوب اسلام" بڑی پُردرد نظم لکھی تھی۔ اس کا یہ شعر زبانِ زدِ عام ہے۔

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

۲؎ اقبال کی بانگِ درا میں "محاصرہ ادرنہ" نظم موجود ہے۔ بلغاریہ کے حملے کے متعلق جواب شکوہ میں انھوں نے کہا ہے:۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا — غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا

چھپتے پھرتے ہیں کبک تیہو سے
گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

تشنہ خوں ہیں بھیڑ کے شیروں کے
حیلہ گر بڈھیوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غمّاز

یہ قطعہ پندرہ شعر کا ہے جس میں مولانا کے مجروح دل کے نالہ و شیون موجود ہیں جو ان کے جذبات کی ملی جلی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر جب ٹرکی کے لیے مولانا ظفر علی خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں سے چندہ وصول کرنا شروع کیا اور طبی اور مالی امداد پہنچانے کے لیے وفد لے کر قسطنطنیہ جانے لگے تو ۵؍ نومبر ۱۹۱۲ء کے خط میں (مکاتیب ۲؍۴۵۳) پوچھتے ہیں کہ "مجھے یہ بھی لکھنا کہ ٹرکی کے لیے پانی پت سے کیا چندہ ہوا اور وہ کہاں بھیجا گیا۔"

۱۹۱۳ء

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ مولانا حالی شروع جنوری ۱۹۱۳ء میں پانی پت واپس آ گئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا انتقال ۱۳؍ مئی ۱۹۱۲ء کو ہوا تھا اور ۱۹۱۳ء کے شروع میں مولوی سید افتخار عالم مارہروی نے "حیات النذیر" تیار کر لی تھی اور چھپنے سے پہلے مولانا حالی کی خدمت میں بھیج دی تھی۔ اس کتاب پر مولانا نے تبصرہ لکھا تھا۔ شروع میں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآنِ پاک کی خوبیاں بیان کی ہیں اور ان ہنگاموں کی طرف اشارہ ہے جو اس ترجمے کے عام محاورات اور زبان کو غیر سنجیدہ کہہ کر کھڑے کیے گئے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "اس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اس وقت کر سکیں گے جب ان کی وفات پر ایک معتد بہ زمانہ گزر جائے گا

اور معاصرین کا دَور ختم ہو کر حبّ و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔" پھر بتایا ہے کہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کے ایک سو نو برس بعد ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ شائع ہوا اور اس کی "با محاورہ اردو اور طرزِ ادائے مطلب" کی وجہ سے پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب بخوبی قرآنِ پاک سمجھنے لگے۔ لیکن بعض لوگوں نے خود کو مستقل مترجم کہلانے کے لیے یا رجسٹری شدہ ترجمۂ نذیریہ سے علٰحدہ اشاعت کرنے کی غرض سے اس ترجمے کے چند الفاظ بدل دیے ہیں۔ مولانا حالیؔ نے اپنے تبصرے میں تقریباً دو صفحے اسی ترجمے کے متعلق لکھے ہیں پھر لکھتے ہیں کہ "ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے میں جو غیر معمولی قدرت اس شخص (نذیر احمد) کو اپنے سٹائل میں تھی وہ اس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سیّد مرحوم کو اپنے سیدھے سادے سٹائل میں حاصل تھی۔ اسی طرح مولانا کے لیکچروں پر یہاں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے جو بقولِ مصنف مسٹر مارٹین بالقابہ نے مولانا کے لیکچروں کے متعلق کہا تھا کہ مدتہا برس تک یورپ ایسا سپیکر نہیں پیدا کر سکتا۔" پھر حیات النذیر پر مختصر تبصرہ ہے اور اس کے مصنف نے جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیانات پر ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "الحقوق والفرائض" کے بیانات کو ترجیح دی ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا یہ بیان مولانا (نذیر احمد) کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مصنف کو ایسی دلیری کی اجازت دیتے۔" گویا اس طرح مولانا حالیؔ نے نظری تنقید کے بعد عملی تنقید میں کبھی کبھی کتابوں خامیوں پر بھی بحث کی ہے لیکن اس

بات کا لحاظ ہر وقت رکھا ہے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہونے پائے۔

یہ تبصرہ مولانا حالی نے مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کے لیے تیار کیا تھا اور اسی کے ساتھ ہمدرد کے مناسبِ حال دو رباعیاں بھی لکھی تھیں۔ ان کا ذکر مکاتیبِ حالی (ص۱۰۹) میں ۲۷ مئی ۱۹۱۲ء کے خط میں ہے۔

وہ دو رباعیاں یہ تھیں :۔ (۱)

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یا رب
ہمدرد کو اسم با مسمّیٰ سمجھو
اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے یا رب

(۲)

اقوام میں زندگی کی ہے رُوح جہاں
چونک اٹھتے ہیں ایک دم پیر و جواں
کرتی نہیں وحی امر وہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں

مکاتیبِ حالی (ص۱۱۱) میں ۳ اگست ۱۹۱۲ء کے خط میں مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار) کی مدح میں ۲۲ شعر کا ایک قطعہ ہے جن کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب وہ مغرب کی جانب روانہ ہونے کو تھے میں نے چند ابیات ان کی شان میں لکھی تھیں۔ مگر جب وہ روانہ ہو گئے تو وہ نظم ناتمام رہ گئی۔ کل بمقام دہلی

---

[۱] اسی سال رسالہ "اردو" مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی ادارت میں ماہِ اکتوبر سے شائع ہوا تھا جو صرف دو تین نمبروں کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے پہلے نمبر کی مولانا حالی نے ہمت افزائی کی ہے کہ پٹیالہ کے خلیفہ سید محمد حسین خاں بھی اردو زبان کی خدمت اور اس کے ادب کی اصلاح کے لیے ایک ایسا رسالہ دس سال پہلے نکالنا چاہتے تھے لیکن نہ نکال سکے اب رسالہ امید ہے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔

پانی پت سے اِن کو تار دیا گیا تھا کہ لاہور جاتے ہوئے تھوڑی دیر یہاں بھی قیام فرمائیں۔ارادہ تھا کہ یہ نظم میں خود ان کے سامنے پڑھوں گا مگر تار کا جواب غالباً نہیں آیا اور ہمارے سو اجب التعظیم مسافر بالا بالا لاہور کو روانہ ہو گئے.....

ان ابیات میں سے چند یہ ہیں:-

اے مالکِ دفترِ زمیندار — اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں
اے روحِ روانِ بزمِ احباب — اے چشم و چراغِ بزمِ اخواں
اے دین کے امتحاں میں جانباز — اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں

بلقان و طرابلس میں ناگاہ — اُٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر — جوہر ترے کر دیے نمایاں

ڈالا یہ تری پکار نے غُل — جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس — چلنے لگیں ان دلوں پہ چھُریاں

نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر — تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں

اس کے بعد مولانا حالی کی بقیہ زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ نہیں مل سکے۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ اب ان کی عمر ۷۷ سال کی ہو رہی تھی۔ قویٰ میں اضمحلال عرصے سے ہو رہا تھا اور جن بیماریوں نے انھیں ایک مدت سے پریشان

کر دکھا تھا وہ بھی زیادہ بڑھ گئی ہوں گی۔ بہر حال ۱۹۱۳ء کے بعد ان کا کوئی علمی کام نظر نہیں آتا اور اب ان کو وہ گھڑی دیکھنی پڑی جو سب کو دیکھنی پڑتی ہے۔ آہ!

ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!

سنہ ۱۹۱۴ء

۱۹۱۴ء کا اختتام بڑے بڑے روح فرسا علمی سانحات کی یادگار ہے یعنی ۱۸ نومبر کو مولانا شبلیؔ نے اور ۳۱ دسمبر کو مولانا حالیؔ نے دارِ فانی سے مفارقت دیا۔ اور عجب اتفاق ہے کہ ۱۳۳۳ھ کے شروع مہینے میں جب ایک ہی شب باقی تھی تو شمس العلما مولانا شبلیؔ نے وفات پائی اور ۱۹۱۵ء کی آمد کو جب صرف ایک دن رہ گیا تھا تو شمس العلما مولانا حالیؔ نے رختِ سفر تیار کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بقولِ اقبالؔ:-

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

مولانا احسن مارہروی مرحوم نے ان دو علمی "شمس" کے غروب و کسوف پر ایک پُر درد مرثیہ "کسوف الشمسین" در غمِ شبلیؔ و ماتمِ حالیؔ، لکھا تھا جو اسی زمانے میں نظامی پریس بدایون سے شائع ہوا تھا۔ جس کے دو تین بند ملاحظہ ہوں

؎ حالی کی قبر پانی پت میں درگاہِ قلعہ صاحب کے صحن میں ہے۔ حالی کی صد سالہ کے موقع پر اقبال نے ایک قطعہ کہا تھا۔

طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

سالِ پیوستہ ہجری میں یہی تھی اک شب — کہ ہوئی شبلی مرحوم کی جنت سے طلب
عیسوی سال بھی ہونے دگا رخصت یونہی جب — مر گئے حالی مغفور، غم دل رنج و تعب

نسبتِ یک جہتی کر گئے ظاہر دونوں
سالِ آخر کی طرح ہو گئے آخر دونوں

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی — حال کے ساتھ ہے وابستہ مقالِ حالی
صورتِ بدر ہے رخشندہ کمالِ حالی — آج دنیا میں نہیں کوئی مثالِ حالی

دل ہے پژمردہ طبیعت ہیں بحالی نہ رہی
خاک رہتی کہ یہاں صورتِ حالی نہ رہی

اپنے اسلاف کی تصویر مجسم وہ تھے — گو مؤخر تھے مگر فخرِ مقدم وہ تھے
کاملِ فن وہ تھے استادِ مسلّم وہ تھے — نازکش ہجر میں جن کے ہیں ہم وہ تھے

آدمی ایک نہیں لاکھ نظر آئیں گے
مگر ایسے نہ بشر بارِ دگر آئیں گے

اوپر کے اوراق میں مولانا حالی کی تصنیفات کا ترتیب وار جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان کے ذہنی ارتقا کا حال تدریجاً اور ترتیباً معلوم ہو سکے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی تمام اہم تحریروں کا حوالہ آجائے اور جس قدر حالاتِ زندگی مل سکیں ان کا ذکر اجمالاً آجائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ کس قسم کے حالات میں کس طرح کی چیز ان کے

لہ بعض عربی اور فارسی مضامین کے زمانے کی صحیح تعیین نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ خاص طور پر مغربی حکماء کے اقوال اور روزگار اللہ کے اخلاقی مضامین کے فارسی ترجمے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

قلم سے نکلی اور اس طرح تصنیف اور مصنف دونوں کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ اب ہم مولانا کی اہم خدمات کے متعلق چند اشارات پیش کرتے ہیں۔

مولانا حالی کا تعمیری ادب

اس ذیل میں ہم مختصر طور پر مولانا کی تعمیری خدمات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اشارات سے اصل کی طرف رجوع کیا جا سکے۔

۱۔ ۱۸۶۹ء میں مولانا حالی نے غالب کا مرثیہ لکھ کر اردو ادب میں ایک ایسے مرثیے کی بنیاد ڈالی جس میں صحیح اور حقیقی جذبات ہوں، تکلف، تصنع، لفاظی اور مبالغے وغیرہ نہ ہوں۔ یعنی جو کچھ دل پہ گزرے اسے اس انداز میں بیان کر دیا جائے کہ سننے والوں پر بھی وہی اثر ہو۔ ع سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

۲۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کے ساتھ ہی سرسید نے ایک کمیٹی "خواستگار ترقی تعلیم مسلماناں" قائم کی تھی اور انگریزی تعلیم سے مسلمان قوم جن اسباب کی بنا پر فائدہ نہیں اٹھا رہی تھی ان پر غور کرنے کی دعوت دی تھی اور اس کے لیے انعامی مضامین طلب کیے تھے۔ مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں سرسید کے کاموں کو سراہا اور "سید احمد خاں اور ان کے کام" ایک مضمون ان انعامی مضامین سے ہٹ کر لکھا اور اس وقت سرسید کے رفیق نہ ہونے کے باوجود ان سے تعاون کیا۔ یہ مضمون مولانا کی بے لوث قومی خدمات کا پہلا ادبی شہ پارہ ہے۔

۳ - ۱۸۷۴ء میں لاہور کی انجمن پنجاب کے مناظمے شروع ہوئے۔ بقول مولانا کے "میں نے (ان نظموں میں) نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے"۔ ان مناظموں میں محمد حسین آزاد اور حالی کے علاوہ اور لوگ بھی شریک تھے لیکن حالی شریک غالب تھے اور ان کی نظموں نے واقعی جدید اردو شاعری کی پختہ بنیاد ڈالی۔ ان نظموں کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور جس قدر اُن کا اثر بعد کے شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیچرل شاعری اور مناظر قدرت کی ترجمانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ وطنی شاعری کی ابتدا بھی اسی سال کی تھی۔

۴ - ۱۸۷۴ء کی نظموں میں "مناظرہ رحم و انصاف" بھی ہے جس میں مولانا حالی نے اپنی قوتِ متخیلہ سے نئے نئے اسباب و علل جمع کیے ہیں اور فارسی شعراء کی طرح اردو ادب میں تمثیلی مناظرے شروع کیے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے تمثیلی مضامین "معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکل میں" بعد میں یعنی ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئیں۔

۵ - لاہور کے قیام میں مولانا نے اردو غزل میں جدید رنگ شامل کیا اور اسے عشق و عاشقی تک محدود نہ رکھا بلکہ زندگی سے قریب تر کر دیا اور حکیمانہ نکات بھی شامل کرنے شروع کیے۔ ان کی ترقی یافتہ غزلوں میں سے ایک یہ ہے :- ؎

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

اردو کی جاہد غزلوں میں ایسی مرقع غزل شاید ہی کہیں نظر آئے گی۔

۶ - ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں "تعلیم اخلاق و خانہ داری" مقصود تھی اور بنات النعش ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں معلوماتِ عامہ کی تعلیم ہے۔ لیکن ۱۸۷۴ء میں مولانا حالی نے بنیادی چیز یعنی عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور مجالس النساء لکھی جس پر انعام ملا اور جو ایک مدت تک مدارسِ نسواں میں داخلِ نصاب رہی۔

۷ - ۱۸۷۴ء میں بجائے بے جا تعریفوں کے مولانا نے صرف حقیقی اور اصلی خوبیوں کو اردو قصیدے میں داخل کرنا شروع کیا۔ اور ۱۸۸۷ء میں فارسی قصیدہ بھی بغیر مبالغوں کے لکھا۔

۸ - ۱۸۷۵ء میں تعلیمی اور قومی شاعری کی بنیاد ڈالی :-

مدرسۂ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات — مزرعۂ قوم پر بارشِ رحمت ہے آج

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مولانا کی ایسی تعلیمی شاعری کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔

۹ - ۱۸۷۵ء سے مولانا عملی نقاد کی حیثیت سے بھی جلوہ گر ہوتے ہیں اور مولانا ذکاء اللہ کی تاریخ کی صحیح تعریف کرتے ہوئے عام ہندوستانی تاریخوں کے مصائب پر بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے اس وقت سے آخر وقت تک جو تنقید لکھی وہ اسی رنگ کی تھی اور اگر اب بھی وہ زندہ ہوتے تو اسی طرز کی تنقید لکھتے کیونکہ وہ کسی طرح کی دل آزاری پسند نہیں کرتے تھے۔

۱۰ - ۱۸۷۴ء میں ایک نظم "جوانمردی کا کام" لکھی تھی جو ایک انگریزی نظم سے ماخوذ

ہے۔ پھر ۱۸۸۰ء میں "زمزمۂ قیصری" کے نام سے انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ کیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ کیا یعنی بغیر حشو و زوائد کے اصل مطالب کو صفائی کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور قوتِ زبان کا بہت بڑا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے دوسرے لوگوں کے لیے ایک راستہ کھول دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ ہماری زبان میں بڑی صلاحیت ہے اور مغربی ادب کی مفید چیزیں آسانی کے ساتھ اخذ کی جا سکتی ہیں۔

۱۱- ۱۸۷۹ء میں سرسید کی تحریک پر مسدّس لکھا جو بے مثل ادبی یادگار ہے اور قومی شاعری کا زبردست کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعے خود مصنفِ مسدّس کو وسعت بخشی ہے۔

۱۲- قوموں کے دل و دماغ کو مغربی علوم کی تحصیل کے لیے تیار کرنا اور کورانہ تقلید سے بچانا سرسید کے مشن کی خاص چیزیں تھیں۔ مولانا حالی ۱۸۷۱ء سے اپنے مضامین میں اس مشن کو قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے لیکن اب وہ نظموں میں بھی مستقل طور پر پیش کرنے لگے۔ مسدّس کا ضمیمہ اور ترکیب بند "مدرستہ العلوم" (۱۸۸۰ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۳- ۱۸۸۱ء[1] میں آبِ حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اُن رجحانات کا اظہار بھی کیا ہے جو اردو شاعری کی خرابیوں کے متعلق پیدا ہوئے تھے۔ گویا وہ رجحانات ۱۸۸۰ء تک ترتیب پا چکے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں مقدمۂ شعر و

---

[1] اسی سال مولانا محمد حسین آزاد "قواعدِ فارسی" لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے مولانا حالی سے مشورے طلب کیے تھے۔ مولانا حالی کا یہ مفید خط "مکاتیبِ حالی" (۱۹۵۰ء) کے شروع میں ہے۔

شاعری کی ترتیب کا خیال پیدا ہو رہا تھا۔ گو کہ ۱۸۶۷ء سے انھوں نے اس پر قلم اٹھایا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں مناظرہ "واعظ و شاعر" میں بھی محبوب شاعری کا بالواسطہ ذکر آتا ہے۔

۱۴۔ حکیم ناصر خسرو کا (فارسی) سفرنامہ مع محققانہ سوانح کے مولانا نے ۱۸۸۲ء میں شائع کرایا تھا۔ یہ سوانح فارسی زبان میں ہیں اور مختلف مستند کتابوں کے مطالعے کے بعد تیار کرائے گئے ہیں۔ ہندوستان میں کسی ایرانی پر اس انداز کا محققانہ مقالہ حالی کے دور میں ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھا اور ان کے معاصرین میں سے جن بزرگوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان سے حالی کسی طرح پیچھے نہیں ہیں بلکہ الفضل للمتقدم۔

۱۵۔ غالباً ۱۸۸۴ء میں "مناجاتِ بیوہ" لکھی جو بیوہ کی بالواسطہ حمایت کی زبردست علم بردار ہے۔ اس میں اس مجسمۂ عفت کی ایسی پُر درد داستان ملتی ہے کہ غالباً پورے ملک کے ادب میں اس کا جواب نہیں ہے۔ سلاست، دل نشینی، محاکات اور جذبات نگاری کے علاوہ یہ نظم اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے بیوہ کی بالواسطہ حمایت میں یہ کامیاب اور محض کامیاب نظم ہے۔ "چپ کی داد" بھی اسی قبیل کی ہے لیکن "مناجاتِ بیوہ" کا کہیں جواب نہیں ہے۔ خدمتِ انسانیت اس نظم کا مقصد ہے۔

۱۶۔ مناجاتِ بیوہ کے ذریعہ ایک ایسی سادہ اور دل کش زبان کی بنیاد ڈالی جو بلا تامل "غیر منقسم" ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دی جا سکتی ہے ـــــ

یہ اب سے تقریباً ستر سال پہلے کی ایک کامیاب اور لاجواب کوشش ہے
اس نظم کو بلا تکلف اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھا جاسکتا ہے۔

۱۷ - ۱۸۸۶ء کے اوائل میں حیاتِ سعدی شائع ہو چکی تھی - یہ اردو میں سیرت نگاری کے فن میں سب سے پہلی کامیاب کتاب ہے۔ اسی کے انداز پر دوسری سیرت والی کتابیں یعنی خود مولانا حالی کی اور بعد میں مولانا شبلی وغیرہ کی تیار ہوئیں - یعنی پہلے حصے میں معتقدانہ سوانح اور دوسرے حصے میں خدمات کا جائزہ۔

۱۸ - ۱۸۸۶ء میں اولاد کی حمایت میں "مثنوی حقوقِ اولاد" لکھی - یہ بھی خدمتِ انسانیت کے لیے لکھی گئی۔

۱۹ - ۱۸۷۴ء میں "حبِ وطن" نظم لکھ کر وطنی شاعری شروع کر دی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں شکوۂ ہند کے نام سے ترکیب بند لکھا جو ردِ عمل کے طور پر ہے۔ اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کا حال اس انداز میں ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اور شاعر کے آرٹ کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

۲۰ - اسی زمانہ میں "عرضِ حال" یا قصیدۂ غیاثیہ لکھا جو اپنی سلاست اور درد واثر میں اردو کا بہترین قصیدہ قرار دیا جاتا ہے - کون اردو داں ہے جو اس کے ابتدائی اشعار سے واقف نہیں ؟ :-

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے   امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں سب سے پہلا اور سب سے آخر ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۲- بعض فنی سہولتیں بھی مولانا حالی نے پیدا کر نی شروع کر دی تھیں۔ خود بھی ان پر عمل کرتے تھے اور بعض حضرات کو بھی اپنے خطوط میں لکھ دیتے تھے۔

الف- چنانچہ ۲ر فروری ۱۹۰۰ء کے خط میں (مکتوبات ص ۱/۶) لکھتے ہیں:-

"لفظ ہاتھ میں بلا شبہ ہائے مخلوط ہے لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعراء نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فرد گذاشتوں کو جائز کر دیتی ہے۔ مرزا غالبؔ بھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے اردو دیوان میں قافیے کی جگہ کبھو اور کسو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں مگر قافیے میں بات باندھنا جائز سمجھتا ہوں"۔

ب- ۱۲ر مارچ ۱۹۰۰ء کے خط میں (مکتوبات ص ۱/۱) لکھتے ہیں:- "آج کل دہلی میں عموماً نکان کا لفظ مؤنث بولا جاتا ہے اور اکثر حاصل مصدر یا وربل نون (VERBAL NOUNS) جو الف نون سے بنتے ہیں وہ مؤنث ہی بولے جاتے ہیں جیسے چوڑان، چکان، اڑان وغیرہ۔ مگر نہان مذکر بولا جاتا ہے۔

ج- ۱۲ر جولائی ۱۹۰۱ء کے خط میں (ص ۱/۱۶) لکھتے ہیں:-

"بہت ہی عمدہ مثنوی ہے۔ اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، اگرچہ شعرائے ایران و ہندوستان کے مسلمات کے خلاف کیا گیا ہے۔ جیسے کرشمہ کا قافیہ جلوہ۔ یا برسیں کا قافیہ بھر دیں۔

یا بدلا کا قافیہ آیا وغیرہ وغیرہ ۔ مگر میرے نزدیک اب ان قیود کو اٹھا دینا ہی بہتر ہے جن کے سبب سے شاعری کا میدان نہایت تنگ ہوگیا ہے "

د ۔ ۲۶ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں (مکتوبات ص۱۰۹) لکھتے ہیں :۔

" عربی جمع کی تذکیر و تانیث کے متعلق یہ جواب ہے کہ بیشک اہلِ لکھنؤ تو عموماً بصورتِ جمع مذکر کے استعمال کرتے ہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے اہلِ دہلی خاص خاص الفاظ کے سوا ایسی جموع کو عموماً جمع مؤنث کے طور استعمال کرتے ہیں ۔ خود جلیل صاحب نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث میں بنات النعش کی تانیث پر غالب کا یہ شعر لکھا ہے :۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہوگئیں

اردوئے معلیٰ میں ابھی میری نظر سے گذرا ہے کہ نسخے کے موافق حبوب بن گئی ہیں ۔ مگر اس پر کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نے بن گئے کی جگہ بن گئی لکھ دیا ہے ۔ لیکن پہلی مثال بالکل صاف ہے ۔ میرا خیال اس امر کی نسبت یہ ہے کہ بلا شبہ اہلِ دہلی بھی بعض جموع مؤنث کو جموع مذکر پر قیاس کر کے بصورت جمع مذکر استعمال کر جاتے ہیں ۔ مثلاً حوادث و وقائع وغیرہ پر قیاس کر کے شدائد، مصائب، فضائل، رذائل وغیرہ کو بھی بصورت جمع مذکر بول جاتے ہیں لیکن عام طور پر تمام جموع کی نسبت سر دست میرا یہ خیال نہیں ہے "

۲۲ ۔ مقدمۂ شعر و شاعری کی ترتیب کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔ وہ ۱۸۹۲ء میں تیار

ہو گیا تھا لیکن کچھ باقی تھا۔ اور ۱۸۹۳ء میں وہ مکمل ہو گیا تھا۔ یہ چیز بھی اپنے فن کے لحاظ سے اردو زبان میں پہلی چیز ہے اور جب تک اردو میں فنِ تنقید نگاری باقی ہے مولانا حالی کے مقدمے کی اہمیت کم نہ ہو گی۔

۳-۲- اسی زمانے میں مولانا کی ایسی رباعیاں ملنے لگتی ہیں جن میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:-

ع ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

مولانا کی رباعیات کا یہ رنگ آخر عمر تک قائم رہا اور کیوں نہ رہتا جبکہ خود ان کی زندگی ایک حقیقت بن گئی تھی۔

۴-۲- مئی ۱۸۹۴ء سے حیاتِ جاوید لکھنی شروع کر دی تھی لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اس کی تکمیل میں التوا ہوتا گیا۔ آخر کار ۱۹۰۰ء کے آخر میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس سے قبل ۱۸۹۷ء میں یادگارِ غالب شائع ہو چکی تھی۔ یہ دونوں کتابیں فنِ سیرت نگاری میں حالی کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لیے کافی ہیں۔ خصوصاً حیاتِ جاوید کے لیے انھوں نے گہرے مطالعے اور پیہم کوشش سے مواد جمع کیا اور وہ بھی تقریباً ۶۰-۶۲ سال کی عمر میں جبکہ وہ متعدد دوسری الجھنوں میں بھی مبتلا تھے۔ یہ کتاب اسی لیے ہم کو درسِ عبرت دیتی ہے اور جوانوں کو کام کرنے کی ہمت دلاتی ہے۔

۵-۲- مذکورۂ بالا خدمات کے علاوہ مولانا حالی کی "کتابوں سے مسلمانانِ ہندوستان میں تعلیم اور ترقی کی بہت بڑی تحریک پیدا ہوئی ہے" (مکتوبات ص $\frac{9}{2}$)

اور ایشیائی شاعری جو محض ایک بے کار چیز تھی اس کو مفید بنایا گیا ہے

اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا گیا ہے۔" (دوم صفحہ)

غرض کہ یہ خلاصہ ہے مولانا حالی کی خدمات کا اور یہی ان کی اولیات ہیں۔

نہ ہم رہیں گے نہ حالی، یہ دلخراش جہاں
رہے گی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

قطعات و رباعیات

حالی کی خدمات کی تفصیل اوپر آچکی ہے لیکن اگر اس تفصیل کا اجمال دیکھنا ہو تو اُن کے قطعات اور رباعیات (جدید) کی صرف سُرخیاں پڑھ لیجئے جن سے اندازہ ہوگا کہ حالی کا ماحول کیا تھا اور انھوں نے کن خرابیوں کی اصلاح پر زیادہ توجہ دینے کی کوشش کی تھی۔ قطعات کی سرخیاں یا مضامین یہ ہیں :- کبّرۡنا مَوۡتُ الۡکُبَرَاء — شعر کا دلگداز نہ ہونا — مشاعرے کے لیے طرحی غزل لکھنا — شعر و انشا کی لیاقت نہ ہو تو شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیا کرو — بے تمیزیِ ابنائے زماں — خوشامد — سیاسی لیڈر جب اخلاص سے خالی ہوں تو صرف چھچے دار تقریریں کرتے ہیں — بدی کرکے نیک نامی کی توقع — تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر — سرسید کو کافر جاننا اسلام ہے — قرض لے کر حج کرنا — جو قومیں ہمیشہ غلام رہتی چلی آتی ہیں وہ غلامی میں خوش رہتی ہیں — آزاد ملک میں ایک غلام، آزاد نہیں ہو جاتا — سرسید سے لوگ اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ اُن جیسے نہیں ہیں — اہل اللہ کا قحط ہے — نوکروں پر سخت گیری

مضر ہے۔ فیشن کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جس میں وجہ تمیز مفقود ہوں۔ صفائی
اس لیے نہیں رکھتے کہ قبر میں مل جانا ہے۔ دلّی والے باہر والوں کو زبان داں نہیں
مانتے۔ میٹی کے لیے ہم مزاج بر تلاش نہیں کیا جاتا۔ سر سید کی تصانیف کی تردید
میں کمائی ہے۔ یقین کا فقدان ہے۔ استفادہ ہر شخص سے کرنا چاہیے۔ لائق
آدمی، دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سخن بازی اچھی نہیں
نفس کی خواہش پر عقل کو قربان نہ کیا جائے۔ عادات کے غلبے سے عقل بھی مغلوب
ہو جاتی ہے۔ شعراء کو سلطنت میں دخل حاصل نہ ہونا چاہیے۔ غیبت سے خوش ہونا۔
شائستگی کے دعویدار، اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اسراف سے بچنا ضروری ہے۔
نام پیدا کرنے کے لیے نیکی کرنا۔ نیکی کا غرور ہونا بڑی بدنصیبی ہے۔ کالا آدمی جب تک
گورے سے پٹ کر مر نہ جائے بیمار نہیں سمجھا جاتا۔ خود ستائی اور خود بینی عام بیماری ہے۔
نفس کے حملے سے بچنا آسان نہیں۔ جس قوم میں افلاس ہو اس میں بخل اتنا برا نہیں جتنا
اسراف۔ رئیسوں کی تعریف اپنی اغراض کے لیے کی جاتی ہے۔ فقیہ کے نزدیک ایمان
کے لیے زبانی اقرار ضروری ہے۔ اتفاق کی ضرورت۔ دور رہو لیکن دل سے قریب رہو۔
مخلص ناصح اور اہلِ غرض ناصح میں فرق۔ خادم، آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ
ہو جاتے ہیں؟ بعض مرتبہ جابر حاکم کی خوشامد ضروری ہوتی ہے۔ رعیّت پر نا اہل حاکم
کا مسلّط ہونا عذاب ہے۔ عورتوں میں رشک زیادہ ہوتا ہے۔ قانون کمزور کے لیے ہوتا ہے۔
بلوغ سے پہلے شادی مناسب نہیں۔ حرص کے خلاف وہ لوگ وعظ کرتے ہیں جو خود
حریص ہیں۔ امراء کو عقلاء کی ضرورت ہے۔ عصمتِ بی بی از بے چادری۔ تحریروں میں
سچ نہیں ملتا۔ افسر اپنی غلطی کو ماتحتوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ خوشامدانہ

تعریفوں میں ایک بات بھی صحیح نہیں ہوتی۔ تفرقہ ڈالو اور سلطنت کرو لیکن سُبک بات منھ سے نہ نکالو۔ جب مرد حاکم ہوتا ہے تو عورت کے قبضے میں دولت ہوتی ہے اور جب عورت حاکم ہوتی ہے تو مرد کے ہاتھ میں حکومت سمجھنا چاہیئے۔ جو شخص دوسروں کی بڑائی نہ دیکھ سکتا ہو وہی اصلی مغرور ہے۔ کام اچھا کرنا چاہیئے خواہ دیر ہو جائے۔ لے کر ہی ٹلنا اچھی بات نہیں۔ کسی کام میں بھی بے اعتدالی نہ ہونی چاہیے طبیب اپنے مریض کے مرنے پر ملال اس لیے نہیں کرتا کہ اس پر الزام نہ آئے۔ لوگ اپنی خوبی بار بار مختلف پیرایوں میں ظاہر کرتے پھرتے ہیں۔ فضول خرچی گداگر بنا دیتی ہے۔ مذاہب کا اختلاف دور نہیں ہو سکتا۔ اشرف المخلوقات پر مصیبتیں بھی زیادہ ہیں۔ چنڈو بازی اور سہر ترے کا انجام ہی اس کی اصل برائی کو ظاہر کر سکتا ہے۔ دوسری قومیں اپنی جماعتوں کی پاسداری کرتی ہیں لیکن ہماری قوم اپنی ہی قوم کی جڑ کاٹتی ہے۔

سرسیّد کے وہ مضامین جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے ہیں کسی نہ کسی طرح حالی کے ان قطعات کے اصل محرک ہیں۔ یہی حال ان کی رباعیات کا ہے۔ دیوان میں قدیم رباعیات صرف سات ملتی ہیں اور جدید زیادہ ہیں اور ان کے مضامین یہ ہیں:-

صلح کل سے یہ دنیا بھی بہشت ہے۔ عشقیہ اشعار ترک کر دیے۔ بوڑھے لوگ دُکھ درد کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ نیکی میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ بدی ہے۔ ایثار کے وقت ایمان کا امتحان ہوتا ہے۔ عشق بے کار لوگوں کا ایک مشغلہ ہے۔ نیک شخص میں اگر ایک آدھ برائی بھی ہے تو ہرج نہیں۔ دوستوں سے بے جا توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جوانی خود جنون ہے اس لیے شراب کا مزید جنون اختیار نہ کرو۔ غرور سب عیبوں سے بُرا ہے۔ کرنے والا کہتا نہیں ہے۔ صرف جوہر کی قدر ہوتی ہے۔

گاہک کو چار آنکھوں کی ضرورت ہے لیکن بیچنے والے کو ایک کی بھی نہیں۔ عالم وہ ہے جسے اپنی نادانی کا علم ہے اور جاہل کو اپنے جہل کی خبر نہیں۔ موجودہ زمانے میں لوگوں نے عیوب کو ہنر سمجھ لیا ہے اور وہ اسی کو ترقی سمجھتے ہیں۔ فضول خرچ کو فراغت نہیں مل سکتی۔ جو کام کرنا ہو جلد کرو کہ موت سر پر کھڑی ہے۔ جو کام خاص خدا کے لیے کیے جاتے ہیں ان میں بھی کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں جوانی کا مزاج کہاں۔ جب کوئی بڑا کام شروع کرو تو ہر سانس کو غنیمت جانو۔ جس گھر میں بچے آوارہ ہوں اور جوان بے کار ہوں تو وہاں تباہی ہو کر رہے گی۔ ہماری قوم اس قدر زوال آمادہ ہے کہ سنبھلنا نہیں چاہتی۔ منافقت سے قبول عام کیونکر حاصل ہوگا؟۔ آج کل وہ شخص مسلمان سمجھا جاتا ہے جو اپنی قوم کا دشمن ہو۔ اُن بھیڑیوں سے بچو جو بھیڑوں کے لباس میں ہیں۔ بے ہنر لوگوں میں بھی قابل لوگ پیدا ہو سکتے ہیں۔ علم کے بغیر قوم ترقی نہیں کر سکتی، مغرب کی طرح مشرق کو بھی علم سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ باپ کی عزت بیٹے کے لیے مفید نہیں۔ عزت صرف نیکی میں ہے۔ عقل اور دوستی متضاد ہیں۔ عیش و عشرت کا نتیجہ تلخ ہوتا ہے۔ جس میں خوبی نہیں وہ غیبت کرتا ہے۔ عشق سے تباہی ہوتی ہے۔ سلطنت کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب کسی خاتون یا مولوی کو مشیر بنایا جائے۔ دنیا سے بھی دین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جب کسی شخص میں عیب نظر نہیں آتا تو اُسے کافر کہہ دیا جاتا ہے۔ اس قوم میں تباہی ہے جس میں عزت کی پروا نہیں اور ذلت سے عار نہیں۔ باوجود قدرت کے انتقام نہ لینا خدا کے یہاں مقبول ہے۔ سختی کا جواب نرمی سے دیا جائے۔ ہمت کے سامنے کوئی چیز مشکل نہیں۔ غفلت و نادانی کا ثمرہ دوزخ ہے۔ غیر مستحق لوگوں کو دے کر گدائی

میں ڈھیٹ بنایا جاتا ہے۔ پہلے کوشش کرو پھر دعا کرو۔ جان کے ساتھ کام ہے۔ جاہل درویش اپنے عیوب کو چھپانے کے لیے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ دہری ایک خدا کو چھوڑتا ہے اور قبر پرست بہت سے خدا بنا لیتا ہے۔ اصلاح صرف حدِ اعتدال تک مناسب ہے۔ بعض لوگ اپنی تعریف سن کر اس لیے ناخوش ہوتے ہیں کہ زیادہ تعریف نہیں کی گئی۔ حسنِ ظن کی وجہ سے اصل حال کھلنے نہیں پاتا۔ اہلِ اسلام کی برائی اسلام کے سر تھوپی جاتی ہے۔ انسان سے بدی زائل نہیں ہوتی۔ عالم کا عشق بہت بُرا ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ دولت میں ثابت قدم رہنا مشکل ہے۔ ذلیل لوگ اگر مذمت کریں تو شکر کرنا چاہئے اور اگر تعریف کریں تو سمجھو کہ حالت ٹھیک نہیں۔ بڑھاپا لاعلاج مرض ہے۔ کھانا بغیر بھوک کے بے لطف ہے۔ دولت سے بہتر علم ہے۔ اچھوں کو بُرا سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔ احسان کرو تو صلہ کی خواہش نہ ہو۔ قانون سے بد لوگ نیک نہیں بنتے۔ مخالفت کا جواب خاموشی ہے۔ واعظوں کی سخت کلامی اچھی نہیں۔

قطعات کی طرح یہ رباعیات بھی سرسید کے خیالات سے متاثر ہیں اور صرف ان کے مضامین سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کی اخلاقی بیماریاں کیا تھیں اور انھیں کیونکر دور کیا جا سکتا تھا۔

٭

حالی کی اُردو غزل

جدید اردو شاعری کے لیے مولانا حالی کی شخصیت ایک انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن میں تجدید و تخلیق سے کام لیا ہے اور روایات کو قائم رکھتے ہوئے ان روایات سے بغاوت بھی کی ہے۔ ان کی غزل میں بھی تقلیدی اور تخلیقی دونوں عناصر موجود ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان عناصر کا تجزیہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا ارتقار کس طرح ہُوا۔

حالی نے تقریباً ایک سال تک (۱۸۵۴ء - ۱۸۵۵ء) دہلی میں قیام کیا تھا۔ اس وقت غالب نے اُن سے فرمایا تھا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ سخن کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"[۱] حالی کی ان غزلوں کا علم تو نہیں ہے جن کو دیکھ کر غالب نے یہ رائے دی تھی البتہ ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۶ء) کی لکھی ہوئی ایک تضمین ملتی ہے جو الفول

---

[۱] ترجمہ حالی (مقالاتِ حالی حصۂ اول)

لے قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکّی مدنی العربیؐ" پر لکھی تھی۔ اس میں پانچ بند ہیں اور آخری بند میں حالی کا پہلا تخلص خستہ[1] آتا ہے :-

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت مدحِ نبی
ہاتھ اٹھا سوئے مدینہ دمِ حاجت طلبی
پڑھ زبان سے زرہِ صدق یہ شعر قدسی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

۱۸۵۶ء میں حالی ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں تھے لیکن دوسرے سال کے پُرآشوب ہنگامے کی وجہ سے پانی پت واپس آنا پڑا جہاں وہ قریب چار سال تک بیکاری کی حالت میں رہے لیکن اس زمانے میں انھوں نے منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر اور ادب کا مطالعہ جاری رکھا

ضمیمۂ اردو کلیاتِ نظمِ حالی کے مقدمے میں مولانا لکھتے ہیں "حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم رئیسِ دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں، جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، ہو گیا۔ اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس (یعنی ۱۸۷۲ء تک) ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام ۱۸۵۷ء کے بعد سے زیادہ تر جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا جہاں مخاطب صحیح کمیاب تھا۔ اس لیے وہ فکرِ شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق ازسرِنو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اردو میں فکرِ شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا مگر

---

[1] غالباً غالب کی تقلید میں اور "غالب" کے وزن پر حالی تخلص اختیار کیا تھا۔

جنابِ ممدوح کو اِدھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی ——"

مولانا حالی کا تعلق نواب شیفتہ سے ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا اور اس سے بہت پہلے تذکرۂ گلشنِ بے خار کی ترتیب (۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء تا ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء) کے وقت ہی نواب موصوف اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ عرصہ ہوا کہ شعر و شاعری سے سروکار نہیں ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"فقیر از آوانِ صبا باین شغل منوط بودہ۔ اکثرے عمر گرامی را رایگاں داد۔ چوں ربط باین فن از دیگر اشغالِ حالیہ وفنونِ شریفہ بازمی دارد واکنوں دیرگاہ است کہ سروکارم نیست۔ مگر تحریکِ مخلیان گاہے از واردات بجدیدہ اتفاق می افتد۔ و آنچم بعد سالے ازانکہ ملہمے دہر آنچہ درقدسی عمر خانہ بخش می داشتند از دستِ ساقی مصطبۂ سخن مومن خاں بکاسۂ ام ریختند"

یعنی ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء ہی میں شعر و شاعری سے بہت کم تعلق رہ گیا۔ لیکن اس سن سے بہت پہلے وہ اکیس برس کی عمر میں (یعنی ۱۸۲۵ء مطابق ۱۲۴۱ھ) میں خود کو "پیرِ طریقت" سمجھنے لگے تھے:-

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نو عمری ہی سے مشقِ سخن کرنے لگے ہوں گے۔ اور اکیس برس کی عمر میں (۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء) وہ اچھا خاصہ کلام لکھنے لگے ہوں گے۔ گلشنِ بے خار ستائیس سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا اور

اس کے بعد چونتیس سال کی عمر تک (۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۱ء) وہ حج سے بھی[۱] فارغ ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ لکھتے ہیں:۔

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہشِ صہبا نہیں رکھتے

اوّل تو وہ گلشنِ بے خار کی ترتیب کے وقت ہی شعر و شاعری سے کم ربط رکھتے تھے پھر حج کے بعد یہ ذوق اور بھی کم ہو گیا تھا اور غدر میں وہ جن مصائب کا شکار ہوئے تھے ان کی وجہ سے تو ان کا رہا سہا ذوق قریب قریب ختم ہی ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ گلشنِ بے خار میں جن غزلوں کے اشعار انتخاب میں آئے ہیں ان کے علاوہ دیوانِ شیفتہ کے جدید ایڈیشن میں غزلوں کی تعداد نصف سے کچھ ہی زیادہ[۵۴]

---

۱ حج کا شوق نو عمری سے تھا۔ لکھتے ہیں:۔

آغازِ عمر ہی میں ہے ہم کو خیالِ حج   دلی جو شیفتہ ہے دیارِ عرب سے دور

دیوانِ شیفتہ (نظامی ایڈیشن) کے مقدمے میں لکھا ہے کہ شیفتہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ کو حج کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ کو دہلی واپس پہنچے۔

۵۴ دیوانِ شیفتہ کا جدید ترین ایڈیشن لاہور سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے اور اس کی ترتیب میں تین مختلف ایڈیشنوں سے مدد لی گئی ہے۔ ایسی غزلیں جن کے اشعار گلشنِ بیخار میں نہیں ہیں اس کا نمبر شمار اس جدید ایڈیشن میں یوں ہو گا:۔ ۴-۵-۶-۸-۱۱-۱۲-۱۳-۱۶-۱۸-۲۲-۲۵-۲۶-۲۹-۳۰ تا ۳۷-۳۹ تا ۴۶-۴۸-۴۹-۵۰ تا ۵۶-۵۸ تا ۶۱-۶۵-۶۶-۶۸-۷۳ تا ۷۵-۷۸-۸۱-۸۲-۸۴-۸۵-۸۶-۸۸-۹۰-۹۲-۹۳-۹۶ تا ۱۰۴-۱۰۷-۱۰۹-۱۱۱-۱۱۵ تا ۱۲۲-۱۲۶-۱۲۹-

(باقی بر صفحہ ۲۲۶)

ہو گی۔ یعنی گلشنِ بے خار کی ترتیب کے وقت بھی بہت سی ایسی غزلیں اور ہوں گی جن کا انتخاب اس تذکرے میں نہیں آیا اور پھر بقیۂ عمر میں تو شیفتہ نے لکھنا بھی کم کر دیا تھا۔ تاہم حالیؔ کے ذوق کی وجہ سے ان کا ذوق بھی عود کر آیا۔ ترجمۂ حالیؔ میں ہے :۔

"میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان جو اب تک بکو دیلات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہی کے ساتھ میں نے بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالبؔ کے پاس بھیجا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و صلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا تھا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و

(بقیہ صفحہ ۲۳۵) ۱۳۰-۱۳۲-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۲ تا ۱۵۰-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۶-۱۵۹ تا ۱۶۲-۱۶۴ تا ۱۷۱- گلشنِ بیخار میں ایک شعر یہ ہے جو موجودہ دیوان میں نہیں ہے :۔

معجزِ حسن سے سب جن و بشر ہیں تسخیر — میری بلقیس کو دعویٰ ہے سلیمانی کا

اسی تذکرے میں ایک شعر اس طرح ہے :۔

کیا کہیں گے گر ستم دیکھے کہ بیدید تر — شیفتہ عاشق ہوئے وہ شوق میرا دیکھ کر

لیکن موجودہ دیوان (صفحہ ۱۰۳) میں یوں ہے :۔

بے نقط مجھ کو سنائے گے جو دیکھو گے ستم — آپ عاشق تو ہوئے ہیں شوق میرا دیکھ کر

محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیے کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا۔ ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے[1]

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے ان کے متعلق لکھا ہے:۔

"شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

خود شیفتہ بھی اپنے ذوق کے متعلق کہتے ہیں:۔

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو[2]

---

[1] اس واقعہ سے بہت پہلے گلشن بیخار لکھا تھا اس لیے انیس کا ذکر اس میں نہیں ہے۔

[2] غالب نے غالباً شیفتہ کی فارسی شاعری کے متعلق کہا تھا۔

چوں تو تلاشِ معنی و مضموں نکرد کس غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل

اور شیفتہ نے بھی غالب کے متعلق لکھا ہے:۔

آں کار می کند کہ بہ افسوں نکردہ کس اے حسرتی مپرس ز غالب کہ در غزل

"انداز صاف" کے بارے میں ایک جگہ کہتے ہیں :-

شیفتہ سادہ بیانی نے ہمیں چمکایا　　ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے

اور اپنے دیوان کے متعلق یہ رائے دیتے ہیں :-

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ　　ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم　　ہاں ذکرِ خدو خال اگر ہے تو خال خال

ان کو میر کا انداز پسند تھا اور اسی کی خواہش تھی :-

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے[۱]

بہر حال اسی "خاص قسم کا مذاق" حالی کو پسند آیا تھا اور غالب کی شاگردی کے باوجود شیفتہ سے ہی سے استفادہ کیا تھا :-

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہیں　　شاگرد میرزا کا ہیں مقلد ہوں میر کا

چنانچہ حالی نے جو غزلیں شیفتہ کی صحبت میں لکھیں ان میں میر کی سادہ بیانی عام ہے لیکن میر کا "دردِ غم" نہیں ہے۔

کچھ غزلیں جو قدیم رنگ کی ہیں یعنی حالی کے پہلے دور سے متعلق ہیں ان کا انداز بیان یہ ہے :-

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی　　میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

۱؎ لیکن گلشن بے خار میں میر کے متعلق لکھتے ہیں :- "پست و بلند کہ در کلامش بینی ور طب و یابس کردار بیاتش بنگری، انظر نہ کنی واز نظرش نیفگنی —— چند انکہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہم چناں قصیدہ اش پست پایہ تر۔"

دیات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب — مجھکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا — یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا — اس نے نقاب رخ سے اٹھایا نہیں ہنوز
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے — آج مل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

اس رنگ کی تمام غزلوں میں سادگی اور سادہ بیانی کے علاوہ جو چیز خاص ہے وہ شاعری کے عام مضامین ہیں۔ یعنی وہ تمام مضامین ہیں جن کے خلاف حالی نے بعد میں علمِ بغاوت بلند کیا اور جن کو انھوں نے "چچوڑی ہوئی ہڈی" سے تعبیر کیا ہے اور اس دور میں چونکہ شیفتہ اور غالب سے زیادہ تعلق رہا ہے اس لیے غالب کی "بدیہیات" اور شیفتہ کے توسط سے مومن[1] کی واقع نگاری حالی کے

---

[1] شیفتہ نے مومن کی جن زمینوں کو اختیار کیا تھا ان میں خاص یہ ہیں:۔

ہے گو نہ گونہ شک ابھی عفوِ گناہ میں — جو ہے زباں پر وہ نہیں ہے نگاہ میں
یہ فیضِ عام شیوہ کہاں تھا نسیم کا — آخر غلام ہوں میں تمہارا قدیم کا
یار کو محرومِ تماشا کیا — مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا
کن حسرتوں سے مرتے ہیں ہم تم کو غم نہیں — اپنی بھی مرگ، مرگِ تمنا سے کم نہیں

ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی طرح شیفتہ کی زمین بھی ہے:۔

جو کوئے دوست کو جاؤں تو پاسباں کے لیے — نہیں ہے خواب سے بہتر کچھ ارمغاں کے لیے

انہی شعرا کی ایک اور زمین شیفتہ کے یہاں یہ ہے:۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۲۶۵)

یہاں پائی جاتی ہے اور بعد میں یہ دونوں رنگ ان کی جدید غزلوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ غالب کی "بدیہیات" بہت واضح نہیں۔ مثلاً

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حالی کی قدیم غزلوں میں غالب کا یہی رنگ موجود ہے۔ مثلاً

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

بدیہیات اور حقائق کی ترجمانی ایک شاعر کے اسلوب اور طرزِ نگارش کی وجہ سے جدت کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لیے اس میں دلکشی اور دل فریبی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ایک شاعر اور واعظ کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

حالی کے دورِ اول کی غزلوں میں شاعری کے رسمیہ اور فرسودہ مضامین کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) ذوق کی ایک زمین شیفتہ کے یہاں خوب آتی ہے:۔

جی داغِ غمِ رشک سے جل جائے تو اچھا — ارمان عدو کا بھی نکل جائے تو اچھا

غالب کی زمینوں میں شیفتہ کی یہ غزل بھی خوب ہے:۔

جفا و جور کا اس سے گلہ کیا — جو پوچھے مہربانی کیا، وفا کیا

شیفتہ کی یہ زمین داغ اور امیر نے بھی خوب اختیار کی ہے:۔

کچھ بات راز کی ہے ذرا پاس آئیے — جی میں ہے آج خوب عدو کو بنائیے

ساتھ ہی مومن اور شیفتہ کی واقعہ نگاری بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً :-

اُٹھا ہی چلتے وقت مرونت سے دُور تھا ۔۔۔ رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا[1]

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا ۔۔۔ کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت ۔۔۔ وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

غالب اور مومن کا یہ رنگ حالی کی جدید غزلوں میں بھی کبھی کبھی نظر آجاتا ہے لیکن اس "داستانِ عشق" سے خود حالی نے کئی جگہ "رسمیہ شاعری" کہا ہے۔ یہ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے کہ وہ بھی "دل کی چوٹ" کھائے ہوئے تھے[2]۔

اسی قدیم طرز کی تین غزلیں ۱۸۶۱ء (مطابق ۱۲۷۸ھ) کی لکھی ہوئی ملتی ہیں جن کے متعلق خود حالی نے ایک قصیدہ نعتیہ (میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور) کے حاشیے میں لکھا ہے کہ "یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی کے نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انہی دنوں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔" وہ تین غزلیں یہ ہوں گی :-

کر دیا خوگرِ جفا تو نے ۔۔۔ خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

کر کے بیمار کی دوا تو نے ۔۔۔ جان سے پہلے دل لیا تو نے

دل کو دردِ آشنا کیا تو نے ۔۔۔ دردِ دل کو دوا کیا تو نے

لیکن ان غزلوں میں کوئی "بڑے دعوے" نہیں ہیں سوائے ایک مقطع کے جو یہ ہے :-

---

[1] یہ زمین غالب کی بھی ہے۔

[2] مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون "غزلیاتِ حالی (تنقیدی حاشیے)" میں کچھ ایسا ہی سمجھ لیا ہے۔

حالیؔ اُٹھا ہلا کے محفل کو   آخر اپنا کہا کیا تو نے

یہ سب غزلیں قدیم رنگ کی ہیں اور سوائے اسلوب کے کوئی جدّت نہیں ہے
پھر سنہ ۱۸۶۲ء مطابق سنہ ۱۲۷۹ھ میں جو غزل لکھی تھی اس کے متعلق اسی کے حاشیے میں مولانا
لکھتے ہیں کہ "اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ اوّل ہی اوّل بتقریبِ ملازمت دلّی چھوڑ کر
لاہور جانا پڑا تھا":-

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے   محبّت ہے کہ دل میں موجزن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی   وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات   مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

سیدھے سادے عشقیہ جذبات کے بعد لاہور پہنچنے کا ذکر ہے:-

رہے لاہور میں آکر سو جانے   یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف   مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام   کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

دوسری غزل جو اسی موقع پر لکھی تھی اس میں بھی شروع میں عشقیہ جذبات ہیں
پھر لاہور میں غریب الوطنی کی تکالیف کا بیان ہے۔

دھوم تھی اپنی پارسائی کی   کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت   ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے   تم کو عادت ہے خود نمائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے   رکھیے امید دلربائی کی
شہر سُونا ہے باغ و صحرا سے   بُو نہیں آتی آشنائی کی

ان غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیؔ کی غزل اب عشق کے جذبات تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں گردوپیش کے حالات اور دیگر معاملات کا ذکر بھی ہونے لگا یعنی دل میں جو کیفیات پیدا ہوئیں (عام اس سے کہ ان کا تعلق عشق سے ہو یا کسی اور جذبے سے) وہ بیان کر دی گئیں اور ان کیفیات کا صرف اشارہ نہیں ہے بلکہ ان کا باقاعدہ ذکر ہے۔ گویا یہیں سے حالیؔ نے غزل کی عام روش سے ہٹ کر اس میں وسعت پیدا کی جس سے اردو غزل کی نشاۃِ ثانیہ شروع ہوتی ہے۔

لاہور پہنچنے پر ان کی عمر ۳۷ سال کی ہو چکی۔ ذہنی پختگی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو نثر و نظم میں استادانہ مہارت پیدا کر چکے تھے اور ملک کی سیاست اور ادب دونوں سے واقف تھے۔ اس لیے اردو شاعری کے لیے انھوں نے ایک "نئی طرز" کی بنیاد ڈالی مجموعۂ نظم حالی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔" اس نئی طرز کے اختیار کرنے کا خاص سبب یہ تھا کہ "نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔" انگریزی لٹریچر کی وجہ سے مولوی محمد حسین آزادؔ کے ساتھ جدید اردو نظم

کی ابتدا بھی کی اور خود جدید غزل کے بانی بھی ہوئے یعنی داغ و امیر جن کا طوطی بول رہا تھا ان سے ہٹ کر ایک الگ شاہراہ اختیار کی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا حالی نے غزل کو عشق کے جذبات تک محدود نہ رکھا بلکہ اس میں دل کی دیگر کیفیات اور جذبات کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی۔ لاہور والے مشاعرہ کے متعلق مجموعۂ نظمِ حالی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ درد بست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھی جائے"۔ مولانا حالی کا یہ قول دراصل ان کی جدید غزلوں کے موضوعات کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں کے علاوہ غزلیات میں بھی حقائق اور واقعات پائے جانے لگے اور انھوں نے قصائد تک میں (یعنی ۱۸۷۴ء میں نواب کلب علی خاں مرحوم کی مدح میں اردو قصیدہ اور ۱۸۸۸ء میں فارسی قصیدہ) صرف حقیقی اوصاف بیان کیے اور مبالغوں سے احتراز کیا۔ حقیقت نگاری اور سادہ بیانی کو ان کی فطری سادگی سے بہت زیادہ مناسبت تھی اسی لیے دوسرے شعرا کے مقابلے میں حالی میں یہ صلاحیت بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور انھوں نے لاہور کے قیام کے زمانے سے آخر دم تک جو کچھ نثر و نظم میں لکھا وہ سب کا سب اسی صلاحیت کی غمازی کرتا ہے۔ پھر ۹ر جنوری ۱۸۹۲ء والے خط میں (مکتوبات ص ۱۲۱) موجودہ "مقدمہ شعر و شاعری" کا خاکہ بھی پیش کر دیا تھا کہ "میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہو گئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عُمدہ اصول پر مبنی ہو تو کسی قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔" حالیؔ نے جب شاعری کے متعلق اس قسم کے نظریات پیش کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو ظاہر ہے وہ خود بھی اپنی شاعری میں انہی چیزوں پر عمل کرتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کے مجموعۂ کلام میں بعد میں یہی اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں واضح طور پر حالیؔ نے غزل کی وسعتوں پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس صنف کو اپنے مختلف خیالات اور جذبات کا "آرگن" بنایا جا سکتا ہے اور "اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا؟ کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو گا؟ اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ میٹریل غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی اب کانگڑے اور بھاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔" یہی وجہ ہے کہ حالیؔ نے اپنی غزل میں مختلف مضامین اور موضوعات کی رنگارنگی سے بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے اور ایک ایسا نمونہ پیش کر دیا ہے جس کی تقلید سے اردو غزل ہمیشہ اور ہر زمانے

میں "جدید" کہلائی جاسکتی ہے۔

حالیؔ کی جدید غزل

حالیؔ کی غزل لاہور جانے سے پہلے جس نوعیت کی تھی اس کا ذکر اوپر آچکا ہے لاہور کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا ادبی ذوق کس طرح تبدیل ہوا اس کے متعلق بھی عرض کیا جاچکا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسے ذرائع فی الحال موجود نہیں ہیں جن سے ہم معلوم کرسکیں کہ ان کی کونسی غزل کس وقت اور کس موقع پر لکھی گئی۔ اگر ایسا معلوم ہوسکتا تو بہت آسانی کے ساتھ ہم ان کی اس صنفِ شاعری کی ترقی کا تاریخی اور تدریجی مطالعہ کرسکتے۔ تاہم بعض خطوط اور مضامین میں حالیؔ کے جن اشعار کا ذکر آگیا ہے ان سے اتنا تو ضرور معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں غزل فلاں وقت تک لکھی جاچکی تھی۔ بعض ایسی غزلوں کی نشاندہی اس طرح کی جاسکتی ہے:۔

۱ - ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۳ء والے خط میں (مکتوبات ص ۲۳/۲) یہ شعر ہے (گو کہ دیوان اور مقدمہ اس وقت تک چھپ چکا تھا)

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعفِ ناتوانی

اس غزل کا مطلع یہ ہے:۔

ہے ان کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی
وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ اُن کی مہربانی

۲ - دیوانِ انور پر اپریل ۱۹۰۰ء میں جو تبصرہ کیا ہے اس میں یہ رباعی بھی ہے:۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی

حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اور اسی تبصرے میں [۵۱] یہ دو شعر بھی نقل کیے ہیں :۔

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دل حزیں ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

۳ - ۲۴ ر اگست سنہ ۱۹۰۱ء کے خط میں (مکتوبات ص $\frac{46}{1}$) یہ شعر آتا ہے :۔

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے بس اب یاروں سے شرمانا پڑے گا

اس کا مطلع یہ ہے :۔

کہیں الہام منوانا پڑے گا کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

۴ - ۲۴ ر مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کے خط میں (مکتوبات ص $\frac{5}{1}$) لکھتے ہیں کہ "حیدر آباد [۵۲] کے پے در پے انقلابات سے سرکار عالی پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی ہے۔ ہر جگہ مسلمان اپنے ہاتھوں سے برباد ہوتے جاتے ہیں۔

[۵۱] اسی تبصرے میں دو شعر اور ہیں جو غالباً حالی ہی کے ہوں گے :۔

لگے بڑھنے جب کہ ہوش و خرد لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں

بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

[۵۲] کسی وقت حیدر آباد کے قیام کے دوران میں گرامی مرحوم کی موجودگی میں حالی نے ایک غزل پڑھی جس کا تذکرہ مولانا عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں حالی کے ذیل میں کیا ہے وہ غزل یہ ہے :۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ — یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ یہ ہو رات اب سحر — کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس
تھوڑی سی رات اور کہانی بہت بڑی — حالیؔ نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

اب اس جگر خراش داستان کو ختم کرتا ہوں اور موہوم امیدوں کا ذکر کر کے آپ کا اور اپنا دل خوش کرتا ہوں۔ دربارِ قیصری (یعنی ایڈورڈ کا دربار یکم جنوری ۱۹۰۳ء) میں اگر خدا کو منظور ہے تو حضور (میر محبوب علی خاں) ضرور تشریف لائیں گے اور ان کے ہم رکاب دیگر امرائے حیدرآباد بھی دہلی پہنچیں گے۔ اس سال کانفرنس کا اجلاس دہلی میں قرار پایا ہے اور کارکنانِ کانفرنس کا خیال ہے کہ کسی اجلاس میں حضور کو بھی مدعو کیا جائے۔" پھر ایک یہ شعر بھی نقل کیا ہے:-

ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل
اس لیے ہم بن بلائے میہماں ہونے کو ہیں

۵ - ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء کے خط میں (مکتوبات ص۱/۲۲) مولوی عبدالرحیم خاں بیدل کو پانی پت سے لکھتے ہیں کہ "مخدومی! آپ کی غزلیں دیکھ کر ایک غزل میں نے بھی لکھی ہے۔ فصیح الملک (داغ) کی ایک غزل کبھی دیکھی تھی۔ جس کا مطلع یہ ہے:-

کب تک کھچے رہوگے کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

مگر جب فکر کرنے لگا تو اس کی بحر یاد نہ رہی —— آپ کے مشغلے کے لیے غزل مذکور ارسالِ خدمت کرتا ہوں:-

نہ عیشِ کیخسروی رہے گا، نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گئے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے نہ اب تمھاری بنی رہے گی

گرایا تورانیوں کو تو نے، پچھاڑا مازندرانیوں کو
کہاں تلک اے شرابِ غفلت یہ تیری مردافگنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن[1]
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی، دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

کرے گی کچھ عقل رہنمائی، نہ علم سے ہو گی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہی ہمیشہ سَنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا، جو چاہو مقبولِ عام ہونا
رہو گے گر حسنِ ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالیؔ تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہے گی

---

۱ "یونیورسٹی بل کی طرف اشارہ ہے۔" (از حالی)

۶ - ستمبر ۱۹۰۸ء کے خط میں (مکتوب ص ۴۲/۱) دو شعر آتے ہیں :-

ہو عزمِ دیر شاید کعبے سے پھر کر اپنا   آتا ہے نور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا
قیدِ خودی میں رہتے آنے نہیں نظر ہم   وحشت رہے گی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

اِن دنوں مولانا بہت پریشان تھے اور کہیں تنہائی کی جگہ میں رہنا چاہتے تھے۔

۷ - ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو فرید آباد (گوڑ گانو) سے ایک خط میں (مکتوبات حصہ اول ص ۱۰۸) لکھتے ہیں کہ "ٹرکی کی خبریں جو آج کل آ رہی ہیں انھوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے - ایران اور مراکو کی تو فاتحہ خیر پڑھ چکے تھے - اب ٹرکی کی بھی بظاہر خیر نہیں معلوم ہوتی ــــ" اسی زمانے میں یہ اشعار لکھے تھے :-

خیر ہے کہہ اے فلک کہ چار طرف   چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا   ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف   بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک تیہو سے   گھونسلوں میں ہیں عقاب اور شہباز
تشنۂ خوں ہیں بجوئے شیروں کے   حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس   اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ   ہے پُر آشوب جب کہ یہ آغاز

یہ قطعہ پندرہ اشعار کا ہے اور اس سے پہلے اسی غزل میں چھ اشعار پرانے مضامین کے ہیں مثلاً :-

رنجش و التفات و ناز و نیاز   ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں   دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

یہ شیخ، اللہ رے تیری عیاری   کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز[۵۱]

حالی کی صرف ان غزلیات کی تاریخ تعیین ہو سکی ہے۔ تاہم ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آخر عمر تک غزل کے مضامین میں وسعت پیدا کرتے رہے اور قوم، وطن اور ملک کے اور خود اپنے ذاتی حالات پیش کرتے رہے۔ اسی قسم کے مختلف موضوعات ان کی دوسری غزلوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق ان کی نظموں سے بھی ہے۔ دیکھیے حسب ذیل اشعار ان کے ذاتی حالات تجربات اور ملکی و قومی معاملات سے متعلق ہیں[۵۲]:-

(ا) دہلی کی زندگی کے متعلق کہتے ہیں:-

حالی بس اب یقین ہے دلّی کے ہو رہے   ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا
دل سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر   گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

ایک غزل تیس اشعار کی ہے۔ شروع کے چھ اشعار عشقیہ ہیں اور بقیہ "دہلی مرحوم" کے متعلق ہیں:-

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

---

[۵۱] ۴ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں ایک پُر درد شعر نقل کیا ہے:-

خدا ہی جانے سحر ہو نہ ہو جئیں نہ جئیں   شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

[۵۲] لیکن حالی پر یہی اعتراض تھا کہ وہ دہلی کے نہ تھے۔ خود کہتے ہیں:-

معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا   اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو

ممکن ہے کہ اوپر کی متعلقہ غزل ۱۹۰۰ء کے قریب لکھی ہو جبکہ دیوانِ اکبر پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی دہلی کو بہت درد بھرے الفاظ میں یاد کیا ہے۔

داستاں گل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وُہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھُول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دِلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھُول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیّرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبُل کا ترانا ہر گز

(ب) شعر و شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں :-

کچھ کذب و افترا ہے، کچھ کذب حق نما ہے — یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے مُفترا اپنا
سخن میں پیروی کی گو سلف کی — انھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا
ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن — راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
شاعروں نے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے — درد مندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب، پر گاہک ہیں اکثر بے خبر — شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ
اب سُنو حالیؔ کے نغمے عمُر بھر — ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل
حالیؔ کی سن لو اور صدائیں جگر خراش — دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

(ج) ذاتی حالات کے متعلق جو اشارات ملتے ہیں ان سے حالیؔ کی زندگی کے اہم واقعات کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے، پر ہم نے دم نہ مارا
سُر تھے وہی اور تال وہی، پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں[۱]

---

[۱] میر کی بحر غالب نے بھی اختیار کی تھی :-

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاک جیب دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی پہ نچوڑ — شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

کو رچ کی حالی کر دیجئے تیاریاں — ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط

آ گیا حالی کنارے پر جہاز — الوداع اے زندگانی الوداع

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب — آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

نہ خوف مرنے سے جب تھا، نہ اب ہے، کچھ حالی — کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

جی گئے ہم پہ رہے مُردوں سے بدتر حالی — دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

غیروں کو بس گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم — اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار — ناگوار ان سے سوا غیروں کی ہیں غم خواریاں

دل اب محبت سے کوسوں بھاگتا ہے — ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا، بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی، نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

کمال ہے قدرِ بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں حرف گیر د
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

دُکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم — نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

(د) قوم کا دُکھڑا دیا ہے جو "مسدس" کے رنگ میں ہے :-

وہ قوم جو جہاں میں گلِ صدر انجمن تھی — تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا — سعدان میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

اسی طرح گیارہ شعر اور ہیں۔ ایک اور غزل میں قوم کی حالت پیش کی ہے اور مطلع سے لے کر مقطع تک ایک ہی موضوع ہے:۔

کرتے ہیں سَو سَو طرح سے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہُنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا گو بظاہر سب ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں کہتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر

اسی طرح کے سات اشعار اور ہیں۔ ایک اور غزل میں قوم کی پستی کا نقشہ کھینچا ہے اور نصیحت کی ہے:۔

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے رعلمی و اخلاقی
کمالِ کشف دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

پھر ایک پوری غزل ناصحانہ ہے اور بڑی برجستہ ہے:۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی | نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت | جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے | نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت | نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو | اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے | نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

اسی طرح کے بارہ اشعار اور ہیں جو حالی کے وسیع تجربات اور مشاہدات کی گواہی دیتے ہیں۔ پھر اور غزلیں بھی ہیں جن میں کہیں "امید" کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ کہیں دنیا کے خرخشوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور کبھی اپنے ہنر کو انصاف سے دیکھ کر اسے عیب سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک غزل "بوالہوسی" پر ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں | ہیں مئے ناب کے دلال قدح خوار نہیں

ایک پوری غزل "عشق" کی کارفرمائی کے متعلق ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا | جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

ان موضوعات اور غزلیات کی گوناگوں کیفیات[لہ] سے حالی کے مذاق سخن کا

لہ حضرت حر کا ذکر مرثیوں میں تو آتا ہے لیکن حالی نے غزل میں کیا ہے:۔

چھوڑ تھا زخموں میں اور کہتا تھا حر | راحت اس تکلیف میں پائی بہت

ے صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چرا تا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

اور مختلف حالات کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے بلکہ ان کے داخلی شواہد سے ان کی ادبی خدمات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایسی شاعری اپنی وسعتوں کی وجہ سے زندگی اور زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہے اور نئی نئی ادبی روایات بھی قائم کر دیتی ہے جو یقیناً ایک قوم اور ملک کا مقدس ورثہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم بڑی آسانی کے ساتھ کسی قوم کی ثقافت کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں اور عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ حالیؔ نے اگر اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا تو وہ ان کی ادبی زندگی کی بہت بڑی دلیل ہے اور جو نئی روایات انھوں نے پیش کی ہیں ان کی اپج اپنی جگہ مسلم ہے۔

حالیؔ نے ان گوناگوں اختراعات کے باوجود غزل کو اس کی شان سے رگرنے نہیں دیا اور اس کی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی جدید غزلوں میں قدیم روایات بھی ہیں اور غالبؔ اور شیفتہ کا رنگ نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں حسبِ دستور ان شعرا کی زمینیں بھی اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً غالبؔ کی زمینیں یہ ہیں :-

حشر تک یاں پھر شکیبا چاہیے　　　　کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا　　　　منہ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے :-

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک　　　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک[۱]

یا ایک یہ شعر بھی مشہور ہے :-

---

[۱] رام پور کے کتب خانے کے ایک قلمی نسخے میں غالبؔ کی اس غزل میں "ہونے تک" ردیف ہے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو　　عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

اِن شعروں کا پرتو حالی کے یہاں موجود ہے :-

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

غالب کا ایک مشہور شعر ہے :-

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یادگارِ غالب میں حالی نے "لاگ" اور "لگاؤ" کے اشتقاق کی تعریف کی ہے کہ ایک ہی فعل "لگنا" سے یہ دو لفظ متضاد بنائے گئے ہیں۔ حالی نے بھی ان کو استعمال کیا ہے :-

لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل کی گداز تیرے　　پتھر کے دل تھے جن کے اُن کو رُلا کے چھوڑا

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں　　صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد

پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

اسی طرح سے شیفتہ کا ایک مشہور شعر ہے :-

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

حالی بھی کہتے ہیں :-

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

شیفتہ کی ایک غزل ہے :-

دل لیا جس نے بے وفائی کی　　رسم ہے کیا یہ دل رُبائی کی

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر　　دین داری و پارسائی کی

حالی نے اسی زمین میں ایک غزل لاہور ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں لکھی تھی جس میں جدید رنگ موجود ہے :-

دھوم تھی اپنی پارسائی کی ۔۔۔ کی بھی اور کس سے آشنائی کی

یہ بحر چونکہ بہت چھوٹی ہے اس لیے قوانی کی وجہ سے بعض مقامات پر شیفتہ اور حالی میں یک رنگی سی آگئی ہے۔ مثلاً شیفتہ کا شعر ہے :-

تذکرہ صلح کا کرو نہ کرو ۔۔۔ بات اچھی نہیں لڑائی کی

مضمون مختلف ہے لیکن حالی کا شعر یوں ہے :-

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں ۔۔۔ صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

شیفتہ کے مصرعے ہیں :-

ع مجھ کو طاقت نہیں جدائی کی

ع یاں تو قع نہیں رہائی کی

حالی کے مصرعے بھی قوانی کی وجہ سے یوں ہیں :-

ع ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

ع تھی عبث آرزو رہائی کی

دوسرے مصرع میں تو محض قافیہ ہے جو بحر کی تنگی کی وجہ سے بظاہر یک رنگی ظاہر کر رہا ہے ورنہ حقیقت میں مضمون دونوں شاعروں کے یہاں مختلف ہے۔ تاہم حالی بے شبہ جدید اردو غزل کے بانی ہیں اور انھوں نے اختراعات کے باوجود روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دیکھیے ان کی جدید غزلوں میں ایسے دلکش اشعار بہت سے ہیں :-

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل ان کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دل حزیں   ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

یاد اس کی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں   اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے   بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں؟

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر   وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے   کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے   ہنر کی، عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

ضبط کیجے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں   اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجیے

جو کہیے تو جھوٹی، جو سنیے تو سچی   خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

دیکھیے یہ دل کشی اور یہ دل فریبی ان غزلوں میں ہے جن کی اختراعات اور جن کے نئے مضامین کی وجہ سے بعض لوگ حالی کی صحیح قدر نہیں کر سکے تھے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

سرسید اور مقدمۂ شعر و شاعری

سرسید جس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں دین اور دنیا کی بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں یعنی دولت و حشمت، علم و عمل اور زہد و تقویٰ سب کچھ تھا۔ ان کے دادا پردادا کی بہادری اور منصب داری، نانا کا ریاضیات میں وحیدِ عصر ہونا اور والدین کا غیر معمولی دینی شغف اور قومی ہمدردی وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جو اخلاف میں عزم اور حوصلے کے جذبات ودیعت کرتے ہیں اور ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ اثر قبول کرنے والی طبیعتیں بہت جلد اپنے جوہر نمایاں کر سکتی ہیں۔ سرسید نے جب ایسے ماحول میں اپنا بچپن گزارا تو ظاہر ہے کہ ان کے دل میں رفعت پسندی اور علو ہمتی کے جذبات پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ ان کی مذہبی، تاریخی اور سیاسی انداز کی جتنی کتابیں ہیں ان سب میں یہی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں بلکہ یہی جذبات ان تصانیف کے محرک ہوئے۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں سید الاخبار کے لیے مضامین لکھنا اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کی قلمی معاونت کرنا ہمت افزائی کا سامان سہی لیکن ایسے اسباب کا پیدا ہونا اور خود بھائی کا اس ابتدائی عہد کی صحافت میں حصہ لینا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ ان کا عام ماحول کیا تھا اور

وہ اپنے گھر میں کس قسم کے جذبات کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔

سرسید نے جتنی کتابیں لکھیں اور جس قدر کام کیے ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حوصلہ مندی اور مشکل پسندی کو ہر وقت لبیک کہتے تھے اور کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھتے تھے۔ جامِ جم، آثار الصنادید، سلسلۃ الملوک، تحفۂ حسن، تسہیل فی جر الثقیل، تصحیح آئینِ اکبری، تصحیح تاریخ فیروز شاہی، تاریخ سرکشی بجنور، اسباب بغاوتِ ہند، تبیین الکلام، خطباتِ احمدیہ، تفسیر القرآن وغیرہ متعدد کتابیں سرسید کی صبر آزما قوتوں کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ان قوتوں کو بروئے کار لانے کے شروع ہی سے عادی تھے اور آخر وقت تک ان پر عمل پیرا رہے۔ انہی قوتوں نے ان کا کردار اتنا استوار کر دیا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیتیں اُن سے مرعوب ہو جاتی تھیں اور مخالفین بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔

یعنی:- ع   دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

حالی بھی شروع شروع میں سرسید کے مخالف نہیں، تو موافق بھی نہیں تھے۔ ویسے تو ان کی پہلی ملاقات غالباً ۱۸۶۸ء میں نواب شیفتہ کی رفاقت میں ہو چکی تھی اور ممکن ہے کہ اسی وقت سے حالی ان کی طرف جھک گئے ہوں، لیکن ۱۸۷۱ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں حالی اپنے مضمون "سید احمد خاں اور ان کے کام" میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان کا ہم زبان ہوا، نہ اب ہوں امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے ان کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا۔۔۔۔" اور اسی مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور

نہیں، نہ ان کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود، بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔" ان عبارتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کسی وقت ضرور سرسید کے خلاف رہ چکے تھے لیکن ملاقات کے بعد سرسید کا جادو حالی پر چل چکا تھا اور وہ ان کے "ہم زبان" نہ بننے کا عزم رکھنے کے باوجود ان کے "ہم زبان" بن چکے تھے۔ اس اثر کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرسید عمر میں بھی اپنے تمام ادبی رفقاء سے بڑے تھے۔ حالی سے بیس برس اور شبلی سے چالیس برس بڑے تھے۔ خاندانی وقار، ذاتی وجاہت اور اقبال مندی میں بھی بڑے تھے۔ اسی لیے بڑے سے بڑا عالم ان سے مرعوب ہو جاتا تھا اور ان کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

حالی نے شیفتہ کے انتقال کے بعد لاہور کا رخ کیا۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں کہ "نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔" یعنی حالی نے انگریزی ترجموں سے یہ اثر قبول کیا اور ان سے قبل اسی قسم کا اثر سرسید بھی انگلستان میں رہ کر قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ یہ بات قطعی طور پر قرینِ قیاس ہے کہ وہ جو مشرقی لٹریچر کی وقعت حالی کے دل سے کم ہوئی تھی تو اس کا ایک خاص سبب خود سرسید کی ذات اور رسالہ تہذیب الاخلاق اور اس کا پیش رو

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا تعلق ہوگا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد مقدمۂ شعر و شاعری کی ترتیب کا خیال حالی کو ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوا تھا۔[۵۱] اس کے لیے وہ جلال الدین سیوطی کی "المزہر" دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ لندن کا عربی رسالہ "نخلۂ ادبیہ" بھی دیکھا تھا عربی ادب اور اس کی تاریخ اور اسی طرح فارسی ادب کی تاریخ پر بھی نظر تھی۔ ترجموں کے ذریعے انھوں نے یورپ کے اصولِ تنقید بھی دریافت کر لیے تھے اور یونانی، لاطینی اور انگریزی فنِ شعر و تنقید سے بھی بالواسطہ کچھ نہ کچھ استفادہ کر چکے تھے۔[۵۲] لیکن ان تمام ماخذوں سے زیادہ اہم سرسید کے خیالات تھے جو ان کے دل و دماغ

---

۵۱ ۹ جنوری ۱۸۸۸ء کے خط میں (مکتوباتِ حالی - اول ص ۱۴۱) لکھتے ہیں "میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھنا چاہتا ہوں جس میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک ان کی شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعری پر بحث کی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہو گئی ہے اس کی اصلاح کے طریقے بتائے جائیں اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے......"

۵۲ ان تمام ماخذوں کا ذکر راقم الحروف نے غالباً سب سے پہلی بار رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو، کراچی) بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء میں تفصیل سے کیا تھا۔ خصوصاً صفحات ۷، ۱۴، ۲۳ وغیرہ — بعد میں ان میں سے بعض ماخذوں کا ذکر ایک صاحب کے (مرتبہ نسخہ "مقدمۂ شعر و شاعری" لاہور ۱۹۵۳ء) میں بھی آتا ہے جس کا "حرفِ آغاز" گو کہ انھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۲ء کو لکھا لیکن ان کی یہ کتاب اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی اور اس میں رسالہ "اردو" (بابت اپریل ۱۹۵۲ء) کا بھی کئی جگہ ذکر ہے۔

پر مسلط تھے بلکہ ان کی نثر و نظم کا بیشتر حصہ اسی "پیرِ طریقت" کی رہبری کی غمازی کرتا ہے۔
یکم محرم ۱۲۸۹ھ (۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء) کے رسالۂ تہذیب الاخلاق میں قوم کی جہالت اور علم ادب و انشاء وغیرہ کے سلسلہ میں سرسید نے جن نقائص کی نشاندہی کی ہے وہ بعد میں مقالۂ شعر و شاعری میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:-

"... اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہلِ مرکب میں مبتلا ہے۔ وہ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے[1] دین و دنیا دونوں میں بیکار اور نہیں۔ غلط اور بے اصل باتوں کی پیروی کرنا اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کیے ہوئے خیالات کو امورِ واقعی اور حقیقی سمجھ لینا اور پھر ان پر فرضی بحثیں بڑھاتے جانا اور دوسری بات کو گو وہ کیسی ہی سچ اور واقعی کیوں نہ ہو نہ ماننا، لفظی بحثوں پر علم و فضیلت کا دار و مدار ہونا ان کا نتیجہ ہے۔"

"علم ادب و انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کے تُک ملانے اور دُور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں، کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو۔ خطوطِ رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی

---

[1] اسی قسم کے خیالات سرسید کے اس خط میں بھی ہیں جو انھوں نے ۵ ستمبر ۱۸۹۶ء کو سید حسین بلگرامی کو لکھا تھا۔ (خطوطِ سرسید ص ۱۵۰ مطبوعہ بدایوں ۱۹۳۱ء)

کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے جیسا کہ اس میں لکھا ہے یا یہ صرف معمولی مضمون ہے جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ پس ایسی طرزِ تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو بناوٹی اور جھوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔"

"فنِ شاعری جیسا کہ ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہو گی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اُن بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیبِ اخلاق کے ہیں۔

خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب و ناقص پڑ گیا ہے جس سے تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلّی حالت کا کسی پیرایہ یا کنایہ، اشارہ یا تشبیہ و استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔"

اُوپر کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید نے علم ادب و انشاء کی کونسی خرابیاں قابلِ ترک قرار دی ہیں۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں ابنِ خلدون کے اس قول پر بحث کی ہے کہ انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے، نہ معانی پر۔ حالی اس بحث کو سر سید کی طرح ان دلائل پر ختم کرتے ہیں کہ :-

"اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو

اگلے شعراء باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اس کو بھی معلوم ہیں جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور اس نے شاعری کی تکمیل کے لیے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی اور صحیفۂ فطرت کے مطالعے کی عادت نہیں ڈالی اور قوتِ متخیّلہ کے لیے زیادہ مصالحہ جمع نہیں کیا گو زبان پر اس کی کیسی ہی قدرت اور الفاظ پر کیسا ہی قبضہ حاصل ہو۔ اس کو دو مشکلوں میں سے ایک مشکل ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو وہی خیالات جو اگلے شعرا باندھ چکے ہیں تھوڑے تھوڑے تغیّر کے ساتھ انہی کے اسلوب پر بار بار باندھنے پڑیں گے یا ایک ایک مبتذل اور پامال مضمون کے لیے نئے نئے اسلوبِ بیان ڈھونڈنے پڑیں گے جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہے اور نامقبول ہونا قرینِ قیاس ہے۔"[1]

سر سیّد نے غزل کے "بدجذبات" کا ذکر بھی کیا تھا۔ حالی کے یہاں ان کی تفصیل (ص ۱۱۰ و ص ۱۱۱) موجود ہے اس پر اضافہ یوں ہے کہ جبکہ فارسی شعرا کی غزل میں مختلف مضامین اور مختلف جذبات پائے جاتے ہیں تو آج کی غزل میں بھی وہ اور دوسرے واردات شامل کیے جاسکتے ہیں یعنی "اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو ہزارہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔"[2] ان مختلف اقتباسات سے سر سیّد اور حالی کی ہم آہنگی صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے جو ضرورتِ وقت کی وجہ سے تھی اور جس کے بغیر حساس طبیعتوں کو چارہ نہیں۔ سر سیّد نے علم ادب و انشاء کی خرابیاں

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۸ء (مضمون میں اسی ایڈیشن کا حوالہ ہر جگہ ہوگا) ص ۹۲

[2] " " " " " " " " " ص ۱۱۳

بیان کی ہیں ان کا پس منظر بھی پیش کیا ہے کہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے ہماری قوم کس قدر پست ہو گئی ہے۔ اسی مضمون (بابت یکم محرم ۱۲۸۹ھ) میں لکھتے ہیں:-

"علم دین تو خراب" وا ہے جیسا کہ خراب ہونے کا حق ہے۔ اس معصوم، سیدھے سادے سچے، اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے احکام بہت سیدھے پن اور صفائی و بے تکلفی سے، جاہل، ان پڑھ، بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچائے تھے اس میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں گھسیڑی گئیں اور وہ مسائلِ فلسفیہ اور دلائلِ منطقیہ ملائی گئیں کہ اس میں اس صفائی، سچائی اور سادہ پن کا مطلق اثر نہیں رہا۔...... علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقے پر پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ آپس میں دو شخص ایسی محبت اور دل سوزی کی باتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے سننے والے ان دونوں کو یک مغز دو پوست سمجھتے ہیں مگر جب ان کے دل کو دیکھو تو یک پوست و دو مغز سے زیادہ بے میل ہیں۔ صرف مکاری اور ظاہر داری کا نام اخلاق رہ گیا ہے، و بے ایمانی اور دغا بازی کا نام ہوشیاری۔"

"گفتگو پر خیال کرو تو عجب ہی لطف دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ اکثر فحش لفظ تو نہیں ہوتے مگر ہزاروں اکثر فحش مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب اور معقول و ثقہ، نیک دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ دوست کی بات کو جھوٹ کہہ دینا،

دوست کی نسبت جھوٹ کی نسبت کر دینا، یہ تو ادنیٰ روزمرہ کی بات ہے۔ ایک نہایت نیک آدمی اپنے بڑے مقدس دوست کے بیٹے سے عین حالتِ تپاک اور خوش اخلاقی اور جوشِ محبت کی باتوں میں کہہ رہا تھا کہ تمھارے باپ تو جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔ وہ تو دن رات سیکڑوں غپیں ہانک دیتے ہیں۔ ان کی بات پر کیا اعتبار ہے ...... ایک نہایت معزز شریف خاندانی آدمی نے جو صاحبِ تصانیف ہیں اور اردو علم ادب میں مشہور ہیں، تیس منٹ مجھ سے دوستانہ گفتگو کی اور میں نے خوب خیال کر کر گنا کہ ان کے مُنہ سے چھتیس لفظ گالیوں کے نکلے جس میں سے کچھ اپنی نسبت تھیں اور کچھ اس کتاب اور اس کے مصنف کی نسبت جس کا ذکر تھا اور کچھ ادھر اُدھر بیٹھنے والوں اور سننے والوں کی نسبت۔

امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے اور مرغ لڑانے اور کبوتر اڑانے اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ دھندا نہیں۔ نیکی پر متوجہ ہوتے ہیں تو اس کو اتنا گھونٹتے ہیں کہ بدمزہ ہو جاتی ہے اور جب بدی پر اُترتے ہیں پھر تو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں۔"

ان اقتباسات سے سرسید کے عام رجحانات اور خیالات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ وہ جس دل نشین پیرایے میں قوم اور ادب کی خرابیاں بیان کرتے ہیں وہ ضرور مؤثر ہے اور اس کا اثر وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ صرف سوا دو

برس کی کوششوں کے بعد (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) انھیں کامیابی نظر آتی ہے۔ گو کہ ابھی ان کی جدوجہد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو "طریقۂ تعلیم مسلمانان" کے ذیل میں پھر لکھتے ہیں:۔

"زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرزِ بیان اور ان کے الفاظِ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلافِ واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر و غرور کو خود پسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت کرنا، ہمدردی کا دکھنا، مبالغہ آمیز باتوں کا عادی کرنا، گذشتہ زمانے کی تاریخ کو بالکل نا تحقیقی میں ڈالنا اور واقعاتِ واقعی کو مثل قصے و کہانیوں کے بنا دینا سکھلاتے ہیں اور یہ تمام باتیں حال کے زمانے کی طبیعت کے مناسب نہیں ہیں اور اس لیے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو اس سے کچھ فائدہ ہو مضرت حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اول تو یہی کس قدر بڑی مضرت ہے کہ ان کی عمر بے فائدہ چیز میں ضائع کی جاتی ہے . . . . . "

یہ ہماری قوم کی برائیوں کا خلاصہ ہے۔ ان برائیوں کو وہ مسلسل بیان کرتے ہیں اور بار بار دہراتے ہیں تاکہ قوم میں احساس تو پیدا ہو اور وہ اپنے نقصان کو

نقصان سمجھنے لگے۔ ہمارے شاعروں اور خصوصاً قصیدہ نگاروں کے متعلق یکم ذی حجہ سنہ ۱۲۸۹ھ کے رسالۂ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں :-

"جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے دو طرح شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے اُستاد مصوّر کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ، خال خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔"

حالی نے سر سید کی طرح پہلے تو قوم اور سوسائٹی کی خرابیاں بیان کی ہیں پھر حقایق اور واقعات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے یوں لکھا ہے کہ :-

"اگرچہ شاعری کو ابتداءً سوسائٹی کا مذاقِ فاسد بگاڑتا ہے مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ جب جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہو جاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغے سے سب کے کان مانوس ہو جاتے ہیں۔

حقایق و واقعات سے لوگوں کو روز بروز مناسبت کم ہوتی جاتی ہے۔ عجیب و غریب باتوں، سوپر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تاریخ کے سیدھے سادے وقائع سننے سے جی گھبرانے لگتے ہیں۔" (ص ۲۳)

جھوٹ اور مبالغے سے بچنے کے لیے حالی نے اپنے مقدمے میں ایک باب علاحدہ بھی لکھا ہے اور اصلیت نگاری پر زور دیا ہے۔ پھر جھوٹے اوصاف بیان کرنے کے سلسلے میں سرسید کی طرح حالی بھی لکھتے ہیں کہ "تعریف اگر سچی ہو اور عشق اصلی تو شاعر کے لیے میٹریل کی کچھ کمی نہیں۔ جس طرح کائنات میں دو چیزیں یکساں نہیں پائی جاتیں، اسی طرح ایک انسان کے محاسن دوسرے کے محاسن سے اور ایک کے دل کے واردات دوسرے کے واردات سے نہیں ملتے۔ لیکن تعریف جب سراسر جھوٹی اور عشق محض تقلیدی ہو تو شعرا کو ہمیشہ وہی باتیں جو اگلے لکھ گئے ہیں دہرانی پڑتی ہیں۔" (ص ۲۱) حالی عملی طور پر بھی اس نظریے کے پابند تھے اور انھوں نے ۱۸۶۸ء میں بے جا تعریفوں کے بجائے صرف حقیقی اور اصلی خوبیوں کو اردو قصیدے میں داخل کرنا شروع کیا تھا۔ یعنی نواب کلب علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے کچھ اشعار جو محفوظ رہ گئے ہیں اس طرح شروع ہوتے ہیں:

خلقِ حق کلب علی خاں جس کے بذل وجود پر ہند سے تا عرب ہیں خاص و عام گواہ

اسی ممدوح کے لیے ۱۸۸۷ء میں ایک فارسی قصیدہ بھی لکھا تھا جو حقیقی محاسن پر مشتمل تھا اور وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

سحر گہ پردہ بگرفتند چوں از زشت و از زیبا
بہ دل گفتم کہ ایں نعمت آمد بر تو از نعما

اس کے متعلق حالیؔ خود بھی لکھتے ہیں کہ "اس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغے سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انہی دنوں میں پہلا دربارِ قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا۔ جی میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بہ قدرِ امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے۔" حالیؔ نے قصیدے کے علاوہ اپنی غزل میں بھی نئے نئے مضامین اور فطری جذبات پیش کرنے کی بنیاد ڈالی تھی اور ۱۸۷۴ء سے وہ اس صنفِ کلام کو عملی طور بھی وسعت دے رہے تھے۔

صرف مذکورۂ بالا اقتباسات ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سر سیّد نے کن چیزوں کو تفصیل سے پیش کیا ہوگا اور تحریر کے علاوہ تقریر سے بھی اپنے مشن کو پھیلانے میں کتنی کوشش کی ہوگی۔ قوم کو جہلِ مرکب، خود فریبی، تکبّر، جھوٹی تعریف، مبالغہ، اسراف اور مختلف اقسام کی بے راہ روی سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اردو ادب کی برائیوں کو بار بار دہرایا کہ اس میں دور از کار خیالات، مبالغے، غیر حقیقی اور غیر فطری باتیں، غلط تعریفیں، لیاقت کا بے جا اظہار، صرف عاشقانہ مضامین، خیال آرائی اور تشبیہات و استعارات کی بھرمار وغیرہ ہے۔ گویا کہ اس ادب میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ حالیؔ تو "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں عرصے سے قلمی تعاون کر ہی رہے تھے اس لیے انھیں سر سیّد کا قرب، مضامین کے ذریعے، ضرور حاصل تھا اور ان سے متاثر ہونا عین ممکن تھا۔ پھر لاہور آنے سے حالیؔ کا مذاق اور بھی بدل گیا۔ اس کا خاص سبب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ

تھا کہ وہ لاہور آ کر انگریزی سے اردو میں منتقل شدہ عبارت کو درست کیا کرتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے ان کو آہستہ آہستہ انگریزی ادب سے مناسبت اور مشرقی ادب سے بیزاری ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۲۸۹ھ (سنہ ۱۸۷۲ء) میں لاہور کے قیام میں ایک نظم "جواں مردی کا کام" ستر اشعار کی لکھی تھی جو ایک انگریزی حکایت سے ماخوذ تھی۔ اس کے علاوہ ان کی غزل میں بھی بہت فرق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی دو غزلیں اس طرح شروع ہوتی ہیں:۔

محبتے کہ دل میں موجزن ہے　　　نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے

کی بھی اور کس سے آشنائی کی　　　دھوم تھی اپنی پارسائی کی

ان غزلوں میں اب صرف عشق کے جذبات نہیں ہیں بلکہ ان میں گرد و پیش کے حالات اور دیگر معاملات کا ذکر بھی ہے۔ غرض کہ حالی کا لاہور آنا بہت مبارک ثابت ہوا اور انھوں نے انگریزی ادب سے بالواسطہ استفادہ کیا۔ ادھر سرسید کی شخصیت اور ان کا رسالہ بھی بڑا کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس رسالہ نے تھوڑے سے عرصے میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی اور ملک کے طول و عرض سے خراجِ تحسین وصول کر چکا تھا۔ سرسید اسی زمانے میں یعنی یکم محرم سنہ ۱۲۹۰ھ کے پرچے میں جبکہ اس کی عمر سوا دو برس ہو چکی تھی یوں لکھتے ہیں "علم ادب اور انشاء سے بھی ہم نے غفلت نہیں کی کیونکہ ہم نے اپنے آرٹیکلوں کو اس طرزِ جدید صاف و سادہ پر لکھا ہے جو دل سے نکلنے والی اور دل میں بیٹھنے والی ہے۔ اس طرز پر لکھنے سے اپنی قوم کو موجودہ علمِ انشاء کی برائی کا بتلانا اور اس میں تبدیلی کی ضرورت ہونا سمجھایا ہے اور اگر ہمارا خیال غلط نہ ہو تو ہم نے اپنی قوم میں اس کا کچھ اثر بھی پایا ہے۔ ہم

نے نامی یورپ کے عالموں اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ اے۔ڈی اور ایس۔ڈی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری اردو زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پہ متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی اور سادگی اس میں پیدا کر سکتی ہے بعض دوستوں نے ہمارے پاس خط بھیجے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری تحریر کو اور سادگیِ عبارت کو پسند کرتے ہیں اور ہمارے مضمونوں کو بھی عمدہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک انگریز دوست نے ہم کو لکھا ہے کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہبِ اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا تھا"[1] لیکن مذہبی مسائل اور ان کی بحث دراصل اس پرچے کا مقصدِ حقیقی نہیں تھا اور شروع شروع میں تو یہ موضوع محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا جیسا کہ یکم محرم ۱۲۹۱ھ (۱۸ فروری ۱۸۷۴ء) کے پرچے میں "تہذیبِ قومی" کے ذیل میں سرسید نے لکھا ہے کہ "اصلی مقصد تو ہمارے اس پرچے کا تہذیبِ قومی ہے۔ مسائلِ مذہبی کی بحث بہ مجبوری

۱؎ غالباً اسی قسم کی ہمت افزائی پر سرسید نے تفسیر لکھی تھی۔ سید حسین بلگرامی کو ۸ نومبر ۱۸۶۹ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ "۔۔۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ کتبِ سنی و شیعہ اس قابل نہیں ہیں کہ بعد تعلیم علومِ جدیدہ کسی مسلمان کا اعتقادِ قلبی مذہبِ اسلام پر رہے صرف معتزلیوں کے اصول مذہب کی کئی اور کتابیں کسی قدر عمدہ معلوم ہوتی ہیں مگر موجود نہیں۔ یہی خیال مجھ کو باعث ہوا ہے کہ میں نے قرآن کی تفسیر لکھی ہے۔" (خطوطِ سرسید۔ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۳۰)

آجاتی ہے۔" اسی زمانے میں حالی اور آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی تائید سے انجمن پنجاب کا "نیا مشاعرہ" قائم کیا تھا اور حالی نے چار نظمیں برکھا رت، نشاطِ امید، حب الوطن اور مناظرۂ رحم و انصاف، اسی مشاعرے کے لیے لکھی تھیں۔ انھوں نے مجموعۂ نظم حالی کے دیباچے میں انہی نظموں کے متعلق لکھا ہے کہ "ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔" حالی کی ان نظموں میں سرسید کے خیالات کی عکاسی کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ نشاطِ امید میں سرسید کے مضمون "امید کی خوشی" اور حب الوطن میں سرسید کے وطنی نظریات کی ترجمانی بھی تھوڑی بہت ضرور موجود ہے۔ اور ان کے اثرات کو قبول کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ سرسید دل کھول کر داد دینے کے عادی تھے۔ دہوکے اسی نئے مشاعرے کے متعلق محمد حسین آزاد کو ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ "حالاتِ مشاعرہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ ابھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا۔ شعر و سخن پر رد و قدح دوسری چیز ہے الا آپس کا نفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنا اس مجلسِ مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی خواب امن پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زورِ سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو.

ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں ہم بیان کیا کر سکتے ہیں؟ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔ ان دنوں بسببِ صیام کچھ کام نہیں ہو سکتا....[1]" سرسید نے پھر بعد رمضان کے ایک طویل مضمون نیچر کے متعلق ضرور لکھا اور یکم محرم ۱۲۹۲ھ (۷ فروری ۱۸۷۵ء) کے پرچے میں "اردو نظم" کے ذیل میں اس پر بحث کرتے ہوئے حالی اور آزاد کو کس قدر سراہا ہے، لکھتے ہیں:- "ہم نے جب نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کچھ تنگ نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علمِ ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجو کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا۔ نہیں وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودتِ طبع اور تلاشِ مضمون کے لیے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔[2] ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ

---

[1] خطوطِ سرسید ص ۲۲۔

[2] حالی نے بھی مقدمۂ شعر و شاعری میں (ص ۲۹) اسی قسم کی بحث کی ہے کہ شعر کے لیے قافیہ ضروری ہے یا نہیں۔

زمانے نے اس کو بھی رفارم کیا اور اہلِ پنجاب اس نقص کو رفع کرنے پر متوجہ ہوئے اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ یاد رہے گا۔

ہز آنر لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب اور مسٹر ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اس مشاعرے کے قائم ہونے پر بڑی توجہ کی ہے جس کی شکر گذاری ہماری قوم پر واجب ہے۔ ہماری قوم کے لائق و فائق لوگوں نے بھی اس پر بخوبی توجہ کی ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد، پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرے کی بقا اور قیام میں سب سے زیادہ ہمت صرف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکتِ الفاظ اور طرزِ ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثنوی خوابِ امن جو آفتابِ پنجاب میں چھپی، ہمارے دلوں کو خوابِ غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی، اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی مناظرۂ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے وہ درحقیقت ہمارے زمانے کے علم ادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگیِ الفاظ، صفائی بیان عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعثِ افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری سے ہمسر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا

ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ اگر ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شکسپیر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامینِ عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامینِ بیانِ واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جاوے گی اور ضرور وہ دن آئے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا فخر کریں گے جیسے کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شکسپیر پر ناز کرتے ہیں۔ مضامینِ بیانِ واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکا پڑ جاتا ہے مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد وہ اندرونی حالت تک بھی پہنچ جائے گا۔

سرسید نے انجمنِ پنجاب کے اس مشاعرے اور اس کے خاص شاعروں کی خوب خوب تعریف کی ہے اور اسی ضمن میں بہت سے گراں قدر مشورے بھی دیے ہیں۔ شاعری کے ظاہری خط و خال (اوزان و قوافی وغیرہ) اور باطنی محاسن (مثلاً نئے نئے موضوعات اور اسالیب وغیرہ) سے متعلق بھی بڑی مفید باتیں بیان کی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ آج کا ادب بڑی حد تک ان کے خواب کی تعبیر معلوم ہوتا ہے۔

حالی نے بھی سرسید کی طرح کچھ واضح الفاظ میں نیچرل شاعری پر بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ: "نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے

کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ مضامین نیچرل کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔[۱] (ص ۶۹)

سر سید نے اس سے پہلے کے مضمون میں جہاں نیچر اور نیچرل شاعری پر بحث کی ہے وہیں اردو کی انشا اور اسلوب کا ذکر بھی کیا ہے اور اپنی کوششوں کی بار آوری پر خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ

---

[۱] بالکل اسی طرح کے خیالات سر سید نے تہذیب الاخلاق (یکم محرم ۱۲۹۲ھ) میں اہلِ زبان کے سلسلے میں پیش کیے تھے۔

نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹا جاتا ہے۔ کہ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جو ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہتے ہیں اُن کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت تحقیق ہو چکے ہیں ان سے آگاہی ہو۔ . . . نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے میر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہوگی ہو۔ میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں گھڑی ہو کہہ دی ہو جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک دہلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ

ایجرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی ہمیشہ کے لئے ادمیسن کی سی ہو جاویں گی۔"

یہاں سرسید کو اعتراف بلکہ دعویٰ ہے اور وہ صحیح بھی ہے کہ ان کی بدولت اردو میں مضمون نگاری (یعنی مقالہ نگاری) کی داغ بیل پڑی اور ہماری زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ ہر مضمون اور ہر موضوع کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ سرسید نے جو خدمات تہذیب الاخلاق کے ذریعے انجام دی ہیں ان کو وہ اجمالاً آخری پرچے میں بیان کرتے ہیں کہ:

"سات برس تک ہم نے بذریعے اپنے اس پرچے کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریکی کے گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس میں اس کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام[1] پر نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں ان کو ہٹایا اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا چمکایا۔ اردو زبان کا

---

[1] سرسید نے مولویوں سے ضرور بیزاری ظاہر کی تھی اور کوشش کی تھی کہ مذہب اسلام پر سے نادانی کی گھٹائیں دور کی جائیں لیکن بعض موقعوں پر انھوں نے غالباً مرض کی شدت کو دور کرنے کے لیے علاج میں بھی ایسی شدت برتی کہ وہ پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سید حسین بلگرامی کو ۱۳ مارچ ۱۸۸۲ء کے خط میں (خطوط سرسید ص ۲۹) لکھتے ہیں کہ "میں تو ان صفات کو جو ذات نبوی میں جمع تھیں دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک سلطنت اور ایک قدوسیت۔ اول کی خلافت حضرت عمر کو ملی۔ دوسری کی خلافت حضرت علی و آئمہ اہل بیت کو۔ مگر یہ کہہ دینا تو آسان ہے لیکن کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے۔ حضرت عثمان نے سب چیزوں کو غارت کر دیا۔ حضرت ابوبکر تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے۔ سچ یہ ہے کہ ایسے میں ان بزرگوں کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے۔ جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا۔"

علم ادب جو خیالات موٹے اور بھدے الفاظ کا مجموعہ ہو رہا تھا اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے جو کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا اردو زبان کے علم ادب میں ترقی پانا یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں گو اس وقت ٹیڑھی ترچھی لہریں کھاتے ہیں مگر پانی میں حرکت ہی کا آجانا کافی ہے پھر وہ خود اپنی چال میں آپ چورس ہو رہے گا۔ اس لیے مناسب ہے کہ اب ہم بس کریں اور پانی کو آپ ہی آپ چورس ہونے دیں۔ . . . . ."

یہ ہے سرسید کی نظری اور عملی خدمات کا خلاصہ اور اسی انداز پر حالی نے اپنی خدمات پیش کیں بلکہ اس طرح کہنا بھی مبالغہ نہ ہو گا کہ حالی نے سرسید کی دوستی سے اسی قسم کی خدمات انجام دینے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کیا اور تمام عمر انہی خدمات کو اپنا لائحہ عمل بنایا۔ چنانچہ حالی کی اس دوستی کے بعد کی تمام تصانیف پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہی اندازہ ہو گا کہ انھوں نے سرسید کے انہی نظریات اور جذبات کی ترجمانی کو اپنا مشغلہ بنایا اور سرسید کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کی ہر طرح کوشش کی۔

حالیؔ کی فارسی شاعری[1]

مولانا حالیؔ کی فارسی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات کا جائزہ لیا جائے جو ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئے اور انھیں نہ صرف شاعری کے لیے آمادہ کیا بلکہ ان تمام قومی اور ادبی خدمات کے لیے تیار کیا جو ہماری تاریخ کی نصف صدی سے متعلق ہیں۔ مولانا حالیؔ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور چونکہ والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اس لیے بڑے بھائی اور بڑی بہن نے سرپرستی کی۔ ان کے اور اپنے متعلق مولانا اپنے خود نوشت سوانح (ترجمۂ حالی) میں لکھتے ہیں کہ:-

"انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنونؔ دہلوی کے بھتیجے نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب کی عین شفقت تھی کہ انھوں نے دسمبر ۱۹۵۱ء میں کراچی میں اس ہیچمدان کی صدارت میں یوم حالی کا جلسہ منعقد کیا اور خود ایک مقرر کی حیثیت سے تقریر کی۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابوبکر احمد حلیم صاحب نے بھی اس جلسے میں تقریر کی۔ راقم الحروف نے یہ مضمون اسی موقع پر پڑھا تھا

پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی بنا پر آگئے تھے، ان سے صرف و نحو پڑھی۔ چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔"

مولانا حالی ۱۸۵۵ء میں دلی سے واپس پانی پت آئے اور کوئی برس ڈیڑھ برس تک وہیں رہے۔ آخر ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ایک اسامی پر مقرر ہوئے، لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے پھر پانی پت واپس آنا پڑا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں رہنا پڑا۔ لیکن اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا یعنی مولوی قاری عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی سے منطق، فلسفہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ پڑھتے رہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کی منتہا صرف اسی قدر ہے۔ ۔ ۔ ۔"

یعنی قریب ۲۴ برس تک مولانا حالی کی تعلیم غیر مسلسل طریقے پر ہوتی رہی اور اس وقت

تک انھوں نے اردو، فارسی ادب کے علاوہ منطق، فلسفہ، حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ میں بھی خاصی دسترس حاصل کر لی تھی بلکہ اردو، فارسی اور عربی کی نظم ونثر بھی لکھ لیتے تھے۔ اور جس زمانے میں (یعنی ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۵ء) مولانا حالیؔ دہلی میں تھے اس وقت وہ مرزا غالبؔ کی خدمت میں جا کر ان سے اردو اور فارسی اشعار کے معنی بھی پوچھتے تھے اور ایک وقت جبکہ اردو یا فارسی کی غزل ان کو دکھائی تو انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" حالیؔ کے لیے غالبؔ کا اس طرح فرمانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ انھوں نے حالیؔ کے صحیح مذاق اور مناسب صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا اور جس طرح شاگرد کی صلاحیت کا ایک دو غزل سے صحیح اندازہ کر لینا ایک استاد کی پختہ کاری کی قوی دلیل ہے اسی طرح خود شاگرد کے فطری اور وہبی شاعر ہونے پر یہ واقعہ بہت بڑی حجت ہے۔ حالیؔ کے اس شاعرانہ مذاق کو جو تقویت بعد میں حاصل ہوئی اس میں نواب شیفتہ کی مصاحبی کو بھی دخل تھا۔ ضمیمۂ اردو کلیاتِ نظمِ حالیؔ کے مقدمے میں مولانا اس بات کا اعتراف صاف لفظوں میں کرتے ہیں کہ "حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں (یعنی ۲۶ سال کی عمر میں) میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم ومغفور رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں جو کہ فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے ہو گیا۔ اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس (یعنی ۱۸۷۲ء تک) ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام ۱۸۵۷ء کے بعد سے زیادہ تر جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا جہاں مخاطب صحیح کمیاب تھا اس لیے وہ فکرِ شعر

کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اردو میں فکرِ شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔" اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالیؔ نے نواب شیفتہؔ کی صحبت میں فکرِ شعر کی طرف توجہ کی وہیں یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ خود شیفتہ بھی حالیؔ کی صحبت میں دوبارہ شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور ان کا شاعرانہ ذوق عود کر آیا۔ ایک جگہ مولانا حالیؔ نے اسی صحبت کو اور بھی سراہا ہے۔ ترجمۂ حالی میں لکھتے ہیں:-

"..... در حقیقت مرزا (غالبؔ) کے مشورہ و صلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب مرحوم کی صحبت سے ہوا تھا" حالیؔ کا یہ بیان ۱۹۰۱ء کا ہے جبکہ نواب صاحب یا ان کے لواحقین سے کوئی "نیاز مندانہ" تعلق نہیں رہا تھا اس لیے شیفتہؔ کی یہ تعریفیں کسی خوشامد کی بنا پر نہیں تھیں بلکہ حقیقت کی آئینہ دار تھیں۔ اور غالبؔ نے تو متعدد مقامات پر شیفتہؔ کے ذوق کی تعریف کی ہے۔ خطوطِ فارسی کے علاوہ جو اشعار اس سلسلہ کے ہیں اُن میں یہ شعر زیادہ مشہور ہے:- ؎

غالبؔ بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ اُو
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد [۵۱]

---

[۵۱] غالبؔ نے شیفتہؔ سے یہ امید کی تھی کہ:-

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ لکھیں شاید — مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

اور جب وہ دہلی چھوڑ کر مستقل طور پر جہانگیر آباد میں رہنے لگے تھے تو غالبؔ اس وقت کہا تھا:-

غالبؔ اگر بہ بزمِ شعر دیر رسید دور نیست — کش بفراقِ حسرتیؔ دل ز سخنوری گرفت

ایک جگہ ہند کے "خوش نفس" شعرا کی جہاں فہرست دی ہے وہاں کہتے ہیں :-

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

لیکن یہ سب کے سب شعرائے فارسی میں ظہوری، بیدل، عرفی، صائب اور نظیری وغیرہ کے مقلد تھے اور انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کے تتبع پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ حالی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں تصنع، تکلف، آورد، مبالغہ، ایہام کا زیادہ رواج تھا۔ لوگ انھی خوبیوں پر سر دھنتے تھے اور انھی خوبیوں والوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اور یہ خوبیاں شروع شروع میں خصوصاً مومن، غالب اور شیفتہ میں بھی جس حد تک پائی جاتی تھیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خود انھی شعرا کے یہاں یہ لے پست ہوئی اور اب مبالغے کی جگہ حقیقت نگاری اور سادگی نے لے لی۔ حالی نے شیفتہ کے ذوق کے سلسلہ میں کہا ہے کہ "وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ ان خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا"[1] حالی کے ذوق کے اس پس منظر پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر ان کے شاعرانہ دماغ کا حال معلوم ہو سکتا ہے اور ان کے ذہنی ارتقا کی تشکیل بھی سمجھ میں

---

[1] ترجمہ حالی۔

آسکتی ہے۔

حالی کی "باقیات" میں سب سے پہلی چیز ان کی اردو تضمین ہے، جو انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں حاجی جان محمد قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر لکھی تھی۔ اس میں پانچ بند ہیں اور آخری بند میں حالی کا پرانا تخلص خستہ موجود ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصفِ نبیؐ ہاتھ اٹھا سوئے مدینہ دمِ حاجت طلبی
پڑھ زباں سے زرہِ صدق یہ شعرِ قدسی سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

اس کے بعد شیفتہ کی مصاحبت کے زمانے میں جو غزلیں یا کسی اور صنف کا کلام حالی نے لکھا تھا تو اس کی تعیین فی الحال مشکل ہے لیکن ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا ایک اردو قصیدہ لغت میں ملتا ہے جو غالب کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ مطلع یہ ہے:۔

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیے سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

لیکن فارسی کلام میں سب سے قدیم چیز جس کی تعیین کی جا سکتی ہے وہ ایک تخمیس ہے۔ غالب کی ایک نعتیہ غزل پر اور جو غالب کی زندگی میں ۱۸۶۹ء سے پہلے کسی وقت لکھی گئی تھی۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

اعجاز از خواصِ لسانِ محمدؐ است عین الحیوٰۃ گم بہ دہانِ محمدؐ است
گہ نور و گہ ہدیٰ کہ از آن محمدؐ است حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

اس تخمیس میں نو بند ہیں اور غالبؔ کی غزل کا ایک شعر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف میں ہے حالیؔ کو بھی اس ظاہری تعریف کے لیے آمادہ کر سکتا تھا لیکن انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ایسا کرنے سے گریز کیا ہے۔
فرماتے ہیں :-

اے خامۂ وصفِ قامتِ معشوق کم نگار   اے دل سخن ز راستِ قداں در میاں مدار
قمری ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار   واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار

کایں جا سخن ز سرو روانِ محمدؐ است

غالبؔ کے زمانے میں وہابی، غیر وہابی کے جھگڑے قائم تھے۔ انھوں نے یہ شعر بہت احتیاط سے کہا تھا کہ :-

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است   اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

لیکن حالیؔ نے جب اس پر تضمین رکھی تو انھوں نے و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی ... ۱۰ الخ سے مضمون اخذ کر کے ایک حجت قائم کر دی اور غالبؔ سے زیادہ احتیاط برتنے کی کوشش کی فرماتے ہیں :-

لطفِ خدا است گر بسرِ کس نہاد دست   قہرِ خدا است چوں ز سرِ کس بر جملہ جست
داند کسے کہ شد ز رمیت رمیت ہست   تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

اسی زمانے کے دو فارسی قطعات بھی یادگار ہیں جن کا ذکر یادگارِ غالبؔ میں تفصیل کے ساتھ ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ مولانا حالیؔ شیفتہ کے ساتھ غالبؔ سے ملنے گئے اور غالبؔ کو پنجگانہ نماز پڑھنے کی نصیحت کی تو انھیں کتنا ملال ہوا اور کس طرح

یہ غزل حالی کے پاس دوسرے دن بھیجی۔

مقصد ہے کہ مرآں راہِ خدا گویند　　　برو برو کہ ازآں سو بیا بیا گویند

حالی نے لکھا ہے کہ اس غزل میں غالب نے حالی پر ایک استاد کی حیثیت سے طعن و تعریض کی تھی۔ حالی نے اس کے جواب میں ایک فارسی قطعہ انیس ۱۹ اشعار کا لکھ کر بھیجا۔ چند اشعار اس کے یہ ہیں:۔

نوائے کہ زدنقِ پیشینیاں بہم شکست　　　زنظم و نثر تو کاندر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بقانونِ ذوق سنجیدی　　　چہ بذلہ ہا کہ باندازِ دل رُبا گفتی
رسید نشۂ عرفاں چو ذکرِ نی راندی　　　شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی
دوید ریشہ بدلہا چو حرفِ مہر زدی　　　دمید نخلِ تمنا چو از وفا گفتی
گہر ببزم فشاندی اگر ثنا خواندی　　　اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی

اسی طرح اور بھی کئی اشعار میں غالب کے ساتھ عقیدت اور محبت کا اظہار ہے اور آخر میں برجستگی اور بے ساختگی اس غضب کی ہے کہ ایسے شعر بہت کم نظر آتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

نہ راہِ حرف بسویت نہ جائے من بہ دلت　　　بجواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی
اگر نہ روئے سخن با تو بود، می گفتم　　　چگونہ گفتی و چوں گفتی و چرا گفتی
دریغ شرطِ ادب نیست بر تو خردہ گرفت　　　ہر آنچہ در حقِ من گفتہ ای بجا گفتی

اس قطعے کے جواب میں غالب نے ایک قطعہ نواب شیفتہ کو لکھا جس میں حالی پر کچھ طنز بھی ہے کہ اگر مجھے دوبارہ پیدا کیا گیا تو میں اس پوری عمر میں صرف دو کام کروں گا۔ ایک تو گذری ہوئی زندگی کی نمازوں کی قضا پڑھ لوں گا۔ دوسرے یہ کہ

حالی سے معافی مانگ لوں گا۔ مولانا حالی نے جب یہ قطعہ دیکھا تو شرمندہ ہوئے اور ایک اور قطعہ نو شعر کا لکھ کر بھیجا۔ شروع کے اشعار یہ ہیں :-

تو اے کہ خارِ فرستادہ بہ سوئے دہی — سزد کہ جانِ گرامی بر آں نثار کنم
نماند قاعدۂ شکر بے ریا بہ جہاں — اساسِ دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضائے دوستی نبود — ز غیر شکوہ و شکایت ز دوست دار کنم

ان اشعار میں حالی اپنے استاد کے سامنے سوائے اپنی بیچارگی اور ندامت ظاہر کرنے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ اور شکوہ و شکایت کے لیے سوائے حسن تعلیل کے کوئی اور عذر بھی کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ آخر میں بڑے لطیف انداز میں غالب کے مذکورۂ بالا طنز کا جواب خلوص و عقیدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں :-

بر آں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس — ز کارہائے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم
ز کردہ توبہ نمایم، ز گفتہ استغفار — دگر سپاسِ تو پنہان و آشکار کنم

اسی زمانے کی یادگار اور چیزیں بھی ہیں، مثلاً حالی نے ایک عریضے میں غالب کو لکھا ہے کہ انھوں نے نظیری کے ایک شعر کو جو ناقص العیار کہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ لطف دیکھیے کہ غالب نے خود ہی حالی سے فرمایا تھا کہ تم میری رائے سے اتفاق یا اختلاف رکھتے ہو تو لکھو۔ اس بزرگانہ شفقت میں شاگرد کا امتحان بھی پوشیدہ ہے، تو ساتھ ہی ساتھ شاگرد کی صلاحیت کا اعتراف بھی ہے۔ حالی پرانے انداز کی فارسی میں لکھتے ہیں کہ :-

"قبلہ و کعبہ سخنے را کہ اندازہ دانان گفتار و اداشناسانِ معنی از نظرِ اعتبار انداختہ باشند، گو ہمہ از نظیری و عرفی باشد بہ ہیچ تاویل و توجیہ طرازِ قبول نتواں

داد، خاصہ نسبتی چو منے کہ بلد راہِ سخن و مرد این فن خود نیم چگونہ این نقش درست تواند نشست؟ الحق شکستہ را بستن و گذشتہ را پیوستن و پارہ را دوختن کارے ست بس دشوار و دشوار تر از آن است طرف شدن با استادانِ فن و مردانِ کار ......"

یہ تو حالیؔ کا عجز و انکسار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیریؔ کے جس شعر کو غالبؔ نے "ناقص العیار" قرار دیا تھا اس کی صحیح تشریح حالی جیسا شخص ہی کر سکتا تھا۔ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ تشریح کی ہے کہ اچھے سے اچھے دماغ کی رسائی آسانی کے ساتھ اس نقطہ خیال تک نہیں ہوتی۔ نظیری کا شعر تھا:۔

جذبِ عشقم فی المثل در حسن پیدا ساختن　　　خضر چاہِ یوسفم، از آبِ حیواں نیستم

خود ہم آپ اس شعر کے معنی پر غور کریں اور دیکھیں کہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟ اور اگر آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا تو اس شخص سے رجوع کریں جس کے متعلق بعض جدید تنقید نگاروں کا دعویٰ ہے کہ یادگارِ غالب میں اس نے اشعار کی صحیح تشریح نہیں کی ہے اور وہ سخن فہم نہیں تھا۔ حالی لکھتے ہیں:۔

"بدانست خاکسار قائل از عشق و حسن دریں شعر عشق و حسن مطلق خواستہ است چنانکہ ایں ہر دو مفہوم از حدیث قدسی کنت کنزاً مخفیا... الخ مستفاد می شود ..... قائل دعویٰ می کند و در دعویٰ خود صادق است کہ من کہ از جملہ اعیان موجودہ اَم، از پیدا ساختن حسن مطلق، حکم جذبِ عشق پیدا کردہ ام۔ گویا خضرم کہ از چاہِ یوسف نشان می دہم، نہ آں خضر کہ ز آبِ حیواں نشان می دہد پس خود را بجذب و عشق و کنز مخفی را کہ عبارت از

حسنِ مطلق است بہ یوسف درچاہ افتادہ تشبیہ دادہ است و وجہِ تشبیہ
ظاہر است، فقط۔"

اسی زمانے کے قریب یعنی ۱۸۶۷ء میں حالی نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فارسی دیوان پر فارسی میں تقریظ لکھی جو سہ نثر ظہوری کے انداز کی ہے۔ دیوانِ سالک اور دیوانِ قلق پر جو تقریظیں ہیں وہ بھی اسی انداز کی ہیں۔ اس زمانے میں حالی پر قدیم فارسی نظم و نثر کا اثر غالب تھا اور وہ "جادۂ ہموار" سے ہٹ کر چل نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ غالب سے زیادہ شیفتہ کے ادبی رجحانات ان کو متاثر کیے ہوئے تھے۔ اسی لیے خیال ہے کہ ان کے فارسی کلام کے مجموعے میں جو غزلیں ہیں وہ اکثر و بیشتر شیفتہ کی مصاحبی کے زمانے ہی کی ہیں۔ حالی نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ "جناب ممدوح (یعنی شیفتہ) کو ادھر (فارسی یا اردو شاعری کی طرف) متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔ فارسی یا اردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے[1]" چنانچہ حالی نے اس زمانے میں سب غزلیں قدیم طرز کی لکھی تھیں۔ غزلوں کی تمہید میں بھی کہتے ہیں کہ "یہ غزلیں اسی زمانے کی ہیں جبکہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا۔ جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھتے چلے آتے تھے اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئی تھیں۔" غزلوں کے اوراق کھولیے شروع ہی میں حمد ملتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ لکھتے ہیں:

اے تکیہ بہ عفوِ تو خطا را   وی ناز بہ خوفِ تو رجا را

---

[1] ضمیمہ کلیاتِ حالی کی تمہید ص۲۔ اسی لیے شیفتہ کی وہ غزلیں جو حالی کی صحبت کے زمانے کی کہی جاسکتی ہیں ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۷ء تک ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے۔

حاجت کند از طرب فراموش | خوانی چو بہ سوئے خود گدا را
جا در دلِ خویش ہم نہ یابد | رانی ز درت چو پاشا را
علت نوبری و بازبندی | بر صنعتِ دیگراں شفا را
تاثیر ز تست و مصلحت را | بد نام نمودۂ دوا را

یہ تو سیدھی سادی حمد ہے۔ اب ادبی شان ملاحظہ فرمائیے:۔

بازارِ صبا نمودۂ گرم | برہم زدہ طرۂ دوتارا
با مشغلۂ ہزار امید | پوشیدہ سراغِ مدعا را
در روشنی ہزار خورشید | گم ساختہ چشمۂ بقا را
برقے ز انقِ برون جہانده | برپا زدہ در رہش گیاہا
زہرے بہ گلوئے جاں فشانده | لب تشنۂ خویش کردہ ما را
در بردن صبر دادہ دستے | اعدا زِ بتانِ دل رُبا را
از غیر گسستہ اند کے | دلہائے بہ الفت آشنا را

دیکھیے، حمد جیسے خشک موضوع کے باوجود کیسی ادبی دلکشی اور رنگِ تغزل کی چاشنی موجود ہے اور انصاف سے کہیے کہ اس دور میں کسی اور شاعر نے ایسی دلفریب حمد لکھی ہے؟ یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور حالی کے معاصرین میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آتی۔ اب غالب کی ایک دو غزلوں سے ان کے شاگرد حالی کی غزلوں کا مقابلہ کیجیے۔ غالب کی ایک غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو | کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

حالی نے اپنی غزل کے مقطع میں غالب کی اس زمین کے قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے:۔

حالی بہ سخن خواہی رفتن ز پئے غالب		دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو

اور شروع کے اشعار یہ ہیں :-

بے نور صفائے دل پنہاں شعلہ ہر پیدا		ای شب تو بپایاں رس وای مہر درخشاں شو
گر جانب وئے ہمت ہست دستے بگریباں زن		ور پائے ارادت ہست لنگے بہ بیاباں شو

لیکن یہ غزل حالی کی ابتدائی مشق کی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس میں ایسے شعر بھی ہیں جوان کے روشن مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً :-

تنہائی و رنجوری داں گہ غم مہجوری		اے مشکل من بکشا، ای مردنم آساں شو

ایک اور شعر ہے جس میں وحدت الوجود کا مسئلہ بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے :-

اے بر تو نقاب از تست، خود جلوہ حجاب از تست
از خود بہ خدا پیوند و ز خویش برآ، آں شو

اور اس سے پہلے کہتے ہیں کہ :-

شیخے ست کہ نگزارد بر ملت خود کس را		اے شیخ ز دیں بر گرد اے گبر مسلماں شو

لیکن غالب کہتے ہیں کہ :-

ہم خانہ بر ساماں بہ، ہم جلوہ فراماں بہ		در کعبہ اقامت کن، در بتکدہ مہماں شو

الفاظ میں حالی کے یہاں ابھی پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی، لیکن مضامین میں (باوجود تنوع کے) دلفریبی پائی جاتی ہے اور انھوں نے کیا خوب کہا ہے کہ تمھارے چہرے پر تم ہی بطور نقاب کے ہو اور تمھارے جلوے کے لیے جب تم ہی حجاب بنے ہوئے ہو تو خدا سے خود کو پیوستہ کر لو اور اپنے سے خود کو محو کر لو۔ غالب کی ایک غزل ہے :-

طاق شد طاقت ز مشقت برگراں خواہم شدن　　مہرباں شو ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن

حالی نے "خواہم شدن" کے بجائے "خواہد شدن" ردیف اختیار کی ہے[1] اور غالب کے مضمون :-

ع　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

سے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے، اور اس طرح اضافہ کیا ہے :-

عشق اگر کیش است ملت ہا کہن خواہد شدن　　منبرے ہر گوشہ از دار و رسن خواہد شدن

غالب نے کہا تھا کہ :-

پیش خود بسیارم و بسیار مشتاقِ توام　　تا کجا صرفِ گداز امتحاں خواہم شدن

لیکن حالی نے محبوب کی طویل بے التفاتی پر اس طرح بے تابی ظاہر کی ہے :-

عمر ہا شد تشنۂ آبِ دمِ شمشیرِ تست　　تیغ برکش ورنہ جاں بیروں ز تن خواہد شدن

یہ اس طرح ہے جس طرح حافظ نے کہا تھا :-

عزم دیدارِ تو دارد جانِ بر لب آمدہ　　باز گردد یا برآید چیست فرمانِ شما

غالب نے کہا تھا کہ :-

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

لیکن حالی نے محبوب کو "شکارِ خویشتن" بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

صید تا افگندہ محوِ دست و بازوئے خود است　　ایں جواں روزے شکارِ خویشتن خواہد شدن

---

[1] غالب کی ایک غزل بالکل حالی کی ردیف و قافیے میں بھی ہے :-

نازِ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن　　ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

لیکن وہ غزل تعلی اور انجام شاعری سے متعلق ہے۔

حضرت شرف الدین ابو علی قلندر پانی پتیؒ کا مشہور شعر ہے:-

من شنیدم یارِ من فردا رود وداع شتاب　　یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

حالیؔ اپنی بے بسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:-

یار و درکوچ است و من خاموش و جاں بیتاب گر　　جذب دل نیست کہ از دستِ من خواہد شدن

غالبؔ اپنے محبوب کے حسن سے مرنے میں بھی زندگی حاصل کرتے ہیں اور بڑی اچھی حجت لاتے ہیں کہ:-

خار و خس ہر گز در آتش سوخت آتش میشود　　مردم از ذوقی لبت چنداں کہ جاں خواہم شدن

لیکن حالیؔ اس وقت حیران تھے۔ ان کو اپنے محبوب کے حسن کی وجہ سے روئے زمین کی ہر چیز حسین نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

می دمد گل ہر کجا پائے نگاریں می نہی　　جادہ چوں از سیر پا تا تی چمن خواہد شدن

حالیؔ نے دوسرے شعراء کی زمینیں بھی اختیار کی ہیں۔ مثلاً حضرت احمد جام علیہ الرحمۃ کی مشہور غزل ہے:-

درسِ عشقت را بیانِ دیگر است　　مرمایں رہ را نشانِ دیگر است

اسی غزل کا وہ شعر بہت مشہور ہے جس کے سننے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کا وصال ہو گیا تھا۔ یعنی:-

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حالیؔ بھی اسی زمین کو اختیار کرتے ہیں:-

خاکساری از جہانے دیگر است　　ایں زمیں را آسمانے دیگر است[۱]

---

[۱] حالیؔ نے خود لکھا ہے کہ یہ مصرع نادانستہ نشاطؔ کے مصرع سے مل گیا ہے۔

اس غزل میں تصوف اور وحدت الوجود کے مضامین کئی جگہ حالی نے باندھے ہیں مثلاً:

با ہزاراں رنگ باید ساختن   یار را ہر لحظہ شانے دیگر است

دل کہ بود از چشم مورے تنگ تر   چوں نظر کردم جہانے دیگر است

المجاز قنطرۃ الحقیقت بھی ہے:-

من ز رویش حسنِ معنی دیدہ ام   آنچہ دل بردہ ست آنے دیگر است

حافظ کی ایک غزل ہے:-

عیبِ رنداں مکن اے اہلِ پاکیزہ سرشت   کہ گناہِ دگراں بر تو نخواہند نوشت

حالی نے یہ زمین بھی اختیار کی ہے:-

من و از مے دو سہ پیمانہ و یار و لبِ کشت   دشمن و نرخ بر و لم بیم و سر پروائے بہشت

یہ زمین مشکل ہے لیکن حالی نے اچھے شعر کہے ہیں۔ غالب نے کہا تھا:-

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

حالی نے یہی مضمون لیا ہے اور بڑی خوبی سے ادا کیا ہے:-

ترسم از کعبہ بری حسرتِ دیدار بخویش   اے فرو ماندہ بہ نظارۂ سنگ و گل و خشت

یہ شعر بھی اس زمین میں اچھا ہے:-

عمر ہا از تو بناکام ہمی باید زیست   وائے آں کس کہ ز کف دامنِ امید بہشت

اور آخر میں تعلّی کے لیے نہیں بلکہ عام مذاق کی پستی کی وجہ سے کہتے ہیں:-

ہر رقم را نبود حسنِ قبول ار نہ ازانی   ورنہ حافظ چہ نوشتہ ست کہ حالی نہ نوشت

اب ایک غزل ایسی سنیے جس کا ہر شعر اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے اور کسی بھی اہلِ زبان کی غزل کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے:-

دگر دردا ز تو ہرگز سیری چشمِ تماشائی ۔۔۔ اگر بر دیدہ[لہ] بنشینی وگر در دل فرود آئی

دگنجد با تو ایں ہنگامہ ہا در شانِ یکتائی ۔۔۔ تو چندیں عالمے با خویشتن داری و تنہائی

ترا شایاں بود خوبی کہ بے مہری و محبوبی ۔۔۔ ترا زیبد دل آرائی کہ با خوئی و زیبائی

تو چشم و گوش بکشائی و شد بہرِ تو ارزانی ۔۔۔ بہ گلشن چہرہ آرائی، بہ بلبل نغمہ پیرائی

نہ دلہا بزمِ مغاں راہست نہ در کوئے گذرگاہست ۔۔۔ تو اندر بہرِ مستوری چہ دانی ذوقِ رسوائی

سرِ راہِ خدا داری و دل سوئے قفا داری ۔۔۔ تو زاں ساں می روی از رہ کہ پنداری ہمی آئی

گواہِ بے گناہی ہائے خود دارد جہانے را ۔۔۔ تو دستِ خود بخونِ حالیِ مسکیں نیالائی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس غزل میں خسرو اور غالب کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ غزل اپنے تغزل، اپنی جذبیت اور حلاوت کے اعتبار سے کسی اچھی غزل سے کم نہیں اور اگر حالی کو زندگیِ جاوید بخشتی ہے تو خود صنفِ غزل کے لیے بھی مایۂ ناز ہے۔ حالی کی نازک خیالی ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتی ہے :-

غمش تا جاں بود با جاں ضرر است ۔۔۔ دگر خود جاں نباشد آں ضرور است

سوئے من آمدہ مشتاق و ز طرزِ نگہش ۔۔۔ می تراود کہ بسوئے دگراں می آید

عشق از خویش بریدن می خواست ۔۔۔ حالی از خلق بریدیم عبث

حدِ نظر آنست کہ رویش نتواں دید ۔۔۔ پیداست کہ ایں مدعیاں بے بصر انند

نازک خیالی کے علاوہ قدرتِ بیانی بھی ہے۔ مثلاً غالب کا مشہور شعر ہے :-

---

لہ مولانا حالی نے خود ہی اس مصرع پر حاشیہ لکھا ہے کہ یہ مصرع حضرتِ امیر حسن سنجری کی غزل سے لیا گیا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :-

تو نور العینی اے مہ رو، تو جانِ جانی اے جاناں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

حالیؔ نے بھی اپنے استاد سے یہی مضمون لیا ہے لیکن اضافہ بھی کیا ہے :-

قدرِ استادیِ من بر درِ خود سنج کہ من — باز گردم ز درِ فردوس اگر وا نبود

اسی طرح اور بھی فرسودہ مضامین ہیں جن میں ندرتِ بیان سے بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔ مثلاً

کارم بہ کسے فتاد کز ناز — پروائے نیاز ما نہ دارد

جاں گدازند بہ لطف و بہ غضب شاد کنند — ہر چہ خواہید ازیں عشوہ گراں می آید

از چشمِ جہاں بیں چہ زیاں اہلِ نظر را — ہر سوئے کہ بینند بہ سوئے تو نگرانند

عجب از خود کنم و سوئے فلک می بینم — چوں خدنگِ تو بسویم ز کماں می آید

بہ کنجِ خانہ شمعے می فروزم — کہ چوں در گیرد اوّل خانہ سوزد

زندگی کے حقائق کی ترجمانی بھی متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ مثلاً ایک سیدھی سادی بات کی مثال کس خوبی سے پیش کی ہے :-

شکوہ گر بر لب نیاید عاقبت کیں می شود — زخم را درماں نہ باشد چوں کہن خواہد شدن

روے از فرع باصل آر کہ اربابِ طلب — گل بہ بینند و سراغِ رہِ گلشن پرسند

یار با تست گرت جذبہ گیرائی ہست — یوسف آخر شود آں جا کہ زلیخائے ہست

غرضکہ حالیؔ کی غزلیات اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بہت سے شاعروں سے اور خصوصاً معاصرین کی اکثر غزلوں سے بہتر ہیں، گو کہ تعداد میں کمتر ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ

حالیؔ نہ ہر حرف دو صد نکتہ نہفتہ ست — سنجند دریں بزم اگر نکتہ ورانند

یہاں تک تو حالیؔ کی غزل گوئی کے متعلق عرض کیا گیا ہے۔ اس کے بعد (یعنی قدیم

طرز کی شاعری کے بعد جب وہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں لاہور گئے تو ان کے ذہنی رجحانات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ترجمہ حالی میں لکھتے ہیں کہ :-

"نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر علم فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں حالی نے عربی کے اشعار تو اچھی خاصی تعداد میں لکھے لیکن فارسی اشعار تو بہت ہی کم لکھے یعنی صرف چھ اشعار کے ایک قطعے کی تعیین ہو سکتی ہے جو اس زمانے میں لکھا گیا تھا اور جو ناظم تعلیمات کرنل ہالرائڈ کی خدمت میں بطور شکر گزاری کے پیش کیا گیا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے :-

اولاً شکر آں کہ فرمودی	حاجتِ بندۂ بے دریغ روا
ثانیاً عذر آں کہ چندیں بار	آمدم از پئے صداعِ شما
آں شنیدی کہ گفت افلاطوں	رنج برد آنکہ در نکوئیہا
رنج او عاقبت بپایاں رسید	لیک نیکی ہمیشہ ماند بجا
راست گویم گزاردن نتواں	حقِ لطفے کہ کردۂ بر ما
می کنم ختم بر دعا گفتار	کہ نیاید ز بندہ غیر دعا

لیکن اس قطعے میں ادبیت نہیں ہے اور اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے

اس کے بعد حالی کا وہ فارسی کلام جس کے زمانے کی ٹھیک تعیین ہو سکے ۱۸۷۷ء سے قبل نہیں ملتا۔ اس سال انھوں نے والئ رام پور نواب کلب علی خاں (المتوفی ۱۸۸۷ء) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے متعلق خود مولانا فرماتے ہیں کہ:-

"اس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی بہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغے سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انھی دنوں میں پہلا دربارِ قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا۔ جی میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بقدرِ امکان مبالغے سے احتراز کیا جائے۔ چونکہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انھوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور دربار میں ان کے شریک ہونے کی قوی امید تھی اس لیے انھی کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا۔۔۔۔۔"

۱۸۷۷ء میں یہ قصیدہ لکھا گیا اور اس سے تین سال قبل یعنی ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں وہ نواب موصوف کی مدح میں ایک اردو قصیدہ بھی لکھ چکے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

ظلِ حق کلب علی خاں جس کے بذلِ وجود کے ہند سے لے تا عرب ہیں خامیٔ حاتمی گواہ

اس قصیدے میں بھی بے جا تعریف نہیں ہے یعنی حالی نے فارسی سے پہلے اردو میں ایسے قصیدوں کی بنیاد ڈالی جس میں مبالغے سے احتراز کیا جائے اور یہ ان کی ادبی اولیات میں سے ہے۔ کاش ہمارے شعراء کا اس پر عمل ہوتا تو قصیدہ جیسی شاندار صنفِ سخن کو زوال نہ آنے پاتا۔ بہرحال فارسی قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

سحر گہ پردہ بر گفتند چوں انداشت وا ز زیبا بدل گفتم کہ ایں نعمت آمد بر تر از نعما

بگفتا نعمتے در قدر از ہم بیش و کم نبود — ز ساقی عین رحمت داں اگر جرعہ و گر مینا
ولے فرمان دہ بیدار دل زیں اصل مستثنیٰ است — کہ چوں او نعمتے نتواں نشاں دادن بہ دنیا
صلاحِ عالمے بارائے او وابستگی دارد — جہاں را چوں چمن سازد و او را چوں چمن پیرا
رعیت را چناں دارد کہ دارد گلّہ را چوپاں — غمِ دلہا خورد زاں ساں کہ بازرگاں غمِ کالا
بہ روز از دادِ مظلوماں زمانے بر نیا ساید — بہ شب چوں پاسباں بیدار باشد بہرِ دلہا
یتیماں را پدر وار اشک ہا از رخ فرو شوید — غریباں را چو غمخواراں بر آرد خارہا از پا
اگر بیوہ زنے نالد ز دستِ ناخدا ترسے — بہ دادِ او رسد زاں پیش کاید بر لبش آوا
گدایاں را دہد بخششے کہ دلہا را غنی سازد — ضعیفاں را دہد زورے کہ پیراں را کند برنا

آپ نے دیکھا کہ تمہید کتنی حسین ہے کہ صبح دم جب کہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں پر سے حجابات اٹھا دیے گئے تو میں نے عارف سے پوچھا کہ کون سی نعمت اچھی ہوتی ہے، اس نے جواب دیا کہ نعمتوں میں سے ایک کو دوسری پر فضیلت کیوں دی جائے، یہی عین رحمت سمجھو جو ساقی پوری صراحی نہ دے تو کم از کم ایک گھونٹ ہی پلا دے، لیکن ایک بیدار دل حکمران اس سے مستثنےٰ ہے کہ اس جیسی کوئی اور نعمت دنیا میں نصیب نہیں ہو سکتی۔ دیکھیے کتنی پاکیزہ تمہید ہے اور گریز کتنا لطیف ہے کہ بغیر تصنع اور بغیر کسی مبالغے کے اصل مدح کی طرف آ گئے ہیں اور نواب کلب علی خاں مرحوم کے حقیقی اوصاف بالواسطہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ قصیدہ ۳۰ شعروں کا ہے جس میں تیرہ مدح کے، تین شعر تمہید اور گریز سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد ایک "بیدار دل حکمران" کی خوبیاں بیان کی ہیں جو بظاہر عمومیت رکھتی ہیں لیکن حقیقت میں اصل ممدوح سے مخصوص ہیں۔ ایسے "بیدار دل حکمران" کے اوصاف کے متعلق ۲۲ شعر ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ :-

اگر خواہی جہاں داورے چنیں بیدار دل بینی — بیا در خیمہ گاہِ دیں پناہِ خسروِ والا

دریں جشنِ شہنشاہی کہ گوئی حشرِ اعیان ست — زمانے چشم و دل بکشا و بنگر مینِ اعیاں را

سحابِ مکرمت کلبِ علی خاں آنکہ در عہدش — گدا از شاہ و مفلس از تونگر دارد استغنا

یعنی ایک عام "بیدار دل حکمراں" کے اوصاف کے متعلق دو شعر کی تمہید کے بعد گریز کیا ہے، پھر اس کے اوصاف بیان کر کے خاص ممدوح کی طرف گریز ہے یعنی گریز در گریز ہے۔ یہ چیز بھی حالی کی قوتِ اختراع سے متعلق ہے۔ اس کے بعد "سخن سنج" ایسی مدح لکھنے پر نازاں ہے لیکن یہاں بھی کوشش کی ہے کہ حقیقی جذبات ہی بیان کیے جائیں تاہم مبالغے بھی کس قدر پائے جاتے ہیں اور ان کی نوعیت کسی قدر نوابی آداب ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ :-

(۱) بجائے کز ہنر منداں کسے را در شمار آرند — ہنر نالد کہ من لی غیرہ فی الدین والدنیا

(۲) بوقتے کز جواں مرداں عزیزے در حساب آید — کرم گوید کہ مالی دونہ ملجیٔ ولا ماوی

(۳) بہ بزمے کز سخن سنجاں حدیثے درمیاں افتد — سخن بر خویشتن بالد کہ ما از شاہ و شاہ از ما

اس کے بعد مصطفیٰ آباد (رام پور) کے اہلِ کمال لوگوں کی تعریف ہے۔ پھر ایک فرضی شخص سے خطاب ہے، جو درباری رئیسوں اور سرکاری مہمانوں کے خیمے دیکھ کر واپس آ رہا ہے :-

تو اے کز سیرِ بزمگاہِ سرانِ ہند می آئی — چہ آوردی بگو از جنسِ معنی ارمغاں مارا

گر از فیض دیدہ از ملک و دولت بہرہ ور جمعے — دلے کم دیدہ باشی علم و دولت را بہم یکجا

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مادح کو اپنا ممدوح ہی سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ :-

بہ گلشن جلوہ ہر نو نہالے دیدنی وارد — ولے در خاطرِ بلبل نہ گنجد جز گلِ رعنا

اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ :-

کسے کو باشد از پیرایۂ علم و ہنر عاری بچشمِ اہلِ دل ہیچ است اگر جمشید اگر دارا

اس کے بعد حالی صاف طور پہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ جتنے اوصاف بیان کیے ہیں وہ مال و دولت کے لالچ کے لیے نہیں ہیں :-

وے بافرِ صورت حسنِ معنی جمع چوں دیدیم بیارستم زباں بستن ز شکرِ واہبِ یکتا

اس کے بعد کچھ اوصاف اور بیان کر کے دعائیہ پر آ گئے ہیں اور دو تین شعر لکھ کر اس طرح قصیدہ ختم کر دیا ہے :-

تکلف نیست در ہر چہ از و علوا زشما گفتم تو دانی حالِ ما یا عالما بالجہر و الاخفا

اس کے بعد حالی نے اور بھی کئی فارسی قصیدے لکھے لیکن وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء کی عید الفطر کے موقع پر نواب سر آسمان جاہ کی تعریف میں جو قصیدہ ہے وہ صرف دعائیہ ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے :-

صباجا روز و شب بکام تو باد صبح نوروز و عید شام تو باد

اس کے بعد اسی سال عید الاضحیٰ کے موقع پر حیدر آباد میں اسی ممدوح کو ایک اور قصیدہ پیش کرنا پڑا۔ اس کا مطلع یہ ہے :-

عیدِ اضحیٰ کہ قریں باد ورودش بہ ظفر باد بر خواجہ ز عیدِ رمضاں فرخ تر

اس قصیدے میں صرف چار اشعار میں معمولی مدح ہے پھر اس شعر سے تملق اور چاپلوسی کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔

آں سر اوج کرامت کہ ز والا گہری بے نیاز آمدہ از مدح چو ماہ از زیور

ہر چند اشعار میں مختلف لوگوں کی مدح سرائی کے طریقے بیان کیے ہیں لیکن آخر میں یوں کہتے

ہیں کہ:۔

پس ہماں بہ کہ کنم ختم سخن را بہ دُعا　　کہ دم عجز نیاید بہ دعا مدحت گر

بس اس طرح سے دو تین شعر کے بعد یہ قصیدہ ختم کر دیا ہے۔ لیکن ایک قصیدہ ضرور اپنی تاریخیت کے اعتبار سے اہم ہے اور وہ امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان کی مدح میں ہے جبکہ وہ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

می رسد گر فرقِ عزت بگذرد از فرقداں　　میزبانے را کہ شاہے چوں تو باشد میہماں

گر بہ رقص آید در و دیوارِ کالج دور نیست　　زیں طرب کآمد بہ بیدارش امیرِ کارداں

دولتِ بیدار مفت ماکہ شد مہمانِ ما　　چوں تو مہمانِ عزیزِ قیصرِ ہندوستاں

اس وقت حالی کو سر سید مرحوم (المتوفی ۱۸۹۸ء) کی یاد آتی ہے:۔

زندہ کاش امروز بودے بانئ ایں درسگاہ　　تا بدیدے پایہ اش بالاتر از وہم و گماں

تا ہمہ امیدہا کاندر دلِ خود بستہ بود　　از قدومِ شہ بچشمِ خویشتن دیدے عیاں

اس قصیدے میں حالی نے اصل مدح بالکل نہیں لکھی۔ بلکہ ممدوح سے خطاب کر کے ۴-۵ شعر میں کالج کے قیام اور اس کی مخالفت وغیرہ کا حال بیان کر دیا ہے اور شکریہ ادا کرنے کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

گر نویسد پارۂ زاں نیست یارائے قلم　　در بگوید اندکے زاں نیست نیروے زباں

پس ہماں بہتر کہ گردد بر دُعا ختم سخن　　زاں کہ ناید جز دعائے خواجہ از ما بندگاں

اس کے بعد دعائیہ لکھ کر قصیدے کو ختم کر دیا ہے۔ ان قصیدوں کے علاوہ حالی کے دو مرثیے بھی ہیں۔ ایک نواب سر سالار جنگ میر تراب علی خاں مدار المہام سرکار

عالی نظام) کی وفات پر ہے۔ وہ ترجیع بند میں ہے اور اس میں دو دو شعر کے نو بند ہیں۔ ترجیعی بیت یہ ہے:

اے اجل گر تنِ بیجاں تہِ خاک کش ببری ۔۔۔ نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

یہ ترجیع بند، سالار جنگ کی قومی خدمات کی وجہ سے لکھا گیا تھا لیکن قومی خدمات اور دل کے صحیح جذبات کی بنا پر در اصل سر سید کا مرثیہ لکھا تھا جو محتشم کاشی کے انداز میں ہے اور غالب کے مرثیے میں جس طرح حالی روئے تھے۔ اس سے زیادہ سر سید کے مرثیے میں وہ روتے بسورتے نظر آتے ہیں۔ غالب کی موت ادب کی موت تھی لیکن سر سید کی موت نہ صرف ادب کی بلکہ تمدن و ثقافت، تعلیم و تہذیب اور ازمنہ ثلاثہ کے اوصاف کی موت تھی، اس مرثیے میں حالی اتنے روئے کہ پھر بقیہ زندگی میں عیش و نشاط کے موقعوں پر بھی انھیں ہنسی نہ آئی چنانچہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ امیر حبیب اللہ خاں جیسی ہستی کی تشریف آوری پر اور دوسرے موقعوں پر قصیدے بھی لکھے ہیں تو ان میں تعریف اور مدح کے اشعار بھی برائے نام ہیں اور انھیں کسی کے اوصاف، سر سید جیسے محسنِ قوم کے اوصاف کے مقابلے میں پسند ہی نہ آتے تھے۔ سر سید کی وفات (۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء) پر محتشم کاشی کی طرح حالی نے بھی سات بند "ترکیب بند" میں لکھے اور ہر بند میں نو شعر کے۔ پہلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

آہ ازیں تیر گذارا کز کماں انداختند ۔۔۔ آہ کز یک زخم قومے نیم جاں انداختند
اے عجب کز رحلتِ فردے ز افرادِ بشر ۔۔۔ عالمے را از قیامت در گماں انداختند
اے عجب کز مردنِ یک پیر مردِ سالخورد ۔۔۔ تاب و تب در کودک و پیر و جواں انداختند
اے عجب کز سوز اندوہِ وفاتِ مسلمے ۔۔۔ مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند

بستہ اند از قوم نقدے بود اندر کیسہ
کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت
بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

نو بہارِ دیگر در باغِ قوم امید نیست
بعد ازو طرحِ خزانِ جاوداں انداختند

تا قیامت گوئی از تاراجِ ما فارغ شدند
کایں مصیبت بر سرِ اسلامیاں انداختند

اہلِ دیں بے پیشوا، قومِ بیکس بے یار ماند
ہمرہ اینہا آمدہ در ہندوستاں انداختند

رفت و با خود رونقِ بزمِ مسلمانی ببرد
ملت از مرگش بیشتر مردہ، مسلمانی بمرد

یہ ترکیب بند بہت طویل ہے اس لیے اس کے جستہ جستہ چند اشعار سنئے اور حالی کے واردات قلبی کا اندازہ لگائیے۔ تیسرے بند کے آخر میں کس قدر صحیح فرماتے ہیں:

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

می تواں مقبولِ عالم گشت اما ہمچو شیخ
بہرِ سودِ خلق مردودِ جہاں نتواں شدن

جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و مشتاقِ پیکاں زیستن

آخری شعر تو غضب کا ہے اور حقیقت ہے کہ اس طرز کے اشعار اپنی مثال آپ ہیں اور حقیقی اوصاف کے صحیح ترجمان ہیں۔ پانچواں بند ادبیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات کے بڑے لطیف نمونے ملتے ہیں اور بے ساختگی، برجستگی اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ چند شعر اور ملاحظہ ہوں:

گوئے از گردش خود ماندہ ست چوگاں را چہ شد
کشتی از جا می نہ جنبد موجِ عماں را چہ شد

دہ بہ ویرانی کشید، وقت ست، دہقانش کجاست
گلہ سرگرداں شود، زود ست، چوپاں را چہ شد

چیرہ شد سہرابِ دوراں، رستمِ دوراں کجاست
یافت فرصت اہرمن، مہرِ سلیماں را چہ شد

تاریکِ ہر کس ندارد تابِ گرزِ روزگار — بر ہمی تابد ہیسے ایں تنگِ سنداں راچہ شد

قوم را ہم عتاب و چشمِ رحم از کس نماند — آں لبِ نفریں سرا، آں چشمِ گریاں راچہ شد

ان کے علاوہ دوسرے اشعار میں سرسیّد کے احسانات کا اجمالاً ذکر ہے اور ان تمام واقعات کی طرف اشارہ ہے جو سرسیّد کی زندگی میں خصوصیت کے ساتھ پیش آئے اور انھوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ آخر میں قوم کو خطاب کر کے حالی بڑی اچھی نصیحت کرتے ہیں کہ:-

مزدِ او ایں بس کہ در اصلاحِ خود کوشید زود

کز شما غیر از شما مطلوبِ او چیزے نہ بود

آخری مصرع میں سرسید کی تمام خدمات کا ایک اور صرف ایک مقصد بیان کیا ہے یعنی قوم سے صرف قوم ہی انھیں مطلوب تھی اور وہ اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے فدا ہو گئے۔ چنانچہ ایسے محسنِ قوم اور ایسے فدائے ملک کے غم میں حالی کا مرثیہ حقیقی ماتم تھا اور اس کے بعد گو کہ اُنھوں نے فارسی میں متعدد قطعات، رباعیات اور قصائد وغیرہ بھی لکھے لیکن ایسی تمام شاعری سے اس سوگوارِ قوم نے انکار کر کے یوں لکھ دیا کہ "میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا"۔ آہ ہم حالی جیسے محسنِ قوم و ادب کو بھی آج فراموش کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے سچ کہا تھا کہ:

قدرِ حالی ز قوم کس نہ شناخت

عاقبت رفت از میانۂ ما

✲